رجسٹرڈ نمبر لے ۳۹۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۷۰۰ صفحات، مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفانِ نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی حسنِ یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالمِ برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوضِ کوثر۔ امام مہدی۔ نورِ محمدی اور پل صراط۔ آتشِ نمرود وغیرہ

ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ سفید، بیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایسا متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرتِ خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد مضامین اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے ان اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔

ترغیباتِ جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہبِ عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

دی مغل لاین لمیٹڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہازران کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کرسکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ - بمبئی

چند ضروری اعلانات

بعض حضرات فروری ۵۲ء کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں۔ حالانکہ فروری کا پرچہ علحدہ شایع نہیں ہوا بلکہ سالنامہ ہی میں شامل تھا، ازراہ کرم اس کو نوٹ کر لیجئے اور فروری کا پرچہ طلب نہ فرمائیے۔

جیسا کہ خیال تھا اڈیٹر نگار کی عدم موجودگی کی وجہ سے اپریل کا پرچہ ایک ہفتہ کی تاخیر سے شایع ہو رہا ہے۔
اڈیٹر نگار اپریل کا پورا پرچہ مرتب کر کے گئے تھے، لیکن چونکہ ملاحظات کے صفحات ان کو پاکستان سے لوٹ کر لکھنا تھے اس لئے انتظار ضروری تھا۔
وہ ۲ر کو لکھنؤ واپس آئے اور ۳ر کو ملاحظات کی کاپی کی کتابت شروع ہوئی۔ ہم اس تاخیر پر معذرت خواہ ہیں

پاکستان کے جن خریداروں نے اب تک نگار کا سالانہ چندہ نہیں بھیجا ہے وہ ازراہ کرم اب توجہ فرمائیں اور آٹھ روپیہ چھ آنے ذیل کے پتہ پر بھیجکر ہم کو اطلاع دیں تاکہ سالنامہ ۵۲ء سے اسوقت تک کے پرچے ان کے پاس بھیجدئے جائیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی

کتابوں کی خریداری بھی اسی صورت سے ہوسکتی ہے۔

علاوہ کراچی کے پاکستان میں نگار ذیل کے ایجنٹوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے:-

مکتبۂ جدید لاہور ——— لندن بُک کمپنی راولپنڈی ——— لندن بک کمپنی پشاور
اکس کویزٹ بک ڈپو ایبٹ آباد ——— نور محمد سایل ڈیرہ غازی خاں

ہندوستان میں نگار کی ایجنسیاں یہ ہیں:-

اندکر جنرل اسٹور نیو مارکیٹ بیجاپور ——— سعید مصطفےٰ نیوز ایجنٹ کہاری ٹولہ مئوناتھ بھنجن ——— آزاد نیوز ایجنسی ۵۹ مزگاؤں روڈ۔ جمشید پور ——— دار الکتاب بک سیلرس رامپور ——— حبیب عبدالرحمن نیوز ایجنٹ تانڈور (حیدر آباد) پربھا بک ڈپو نرمل (نظام آباد) حیدر آباد ——— ادارہ اشاعت اردو مومن پورہ ناگپور ——— عبداللہ غزنوی نیوز ایجنٹ اکولا امیر حسن، کمال الدین بک سیلر بازار تاتار پور بھاگلپور ——— تاج نیوز ایجنسی بکرا منڈی گراؤنڈ ناگپور ——— آزاد بک ڈپو۔ ۲۔ چاندنی چوک بنگلور ——— محمد شفیق خاں نیوز ایجنٹ ۲۔ زکریا اسٹریٹ۔ کلکتہ ——— عشرت نیوز ایجنسی، جمعہ مسجد روڈ۔ ناندیڑ ——— انوار احمد خاں نیوز ایجنٹ اعظم گڑھ ——— ماڈرن نیوز ایجنسی قاضی پورہ کھنڈوا ——— عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴۔ لورچیت پور روڈ کلکتہ ——— محمد نصر اللہ انصاری گاندھی محمد علی میموریل انٹر کالج بلتھرا روڈ (بلیا) حنیف بک ڈپو محمد علی روڈ ۵۰/ ۴۱۔ منارہ مسجد بمبئی ——— فیس بک ہاؤس منڈی بازار برہان پور ——— محمدی کتب خانہ متصل جے جے اسپتال بمبئی ——— مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ حیدر آباد۔

منیجر نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہوگیا اور اپریل کا "نگار" آٹھ روپیہ چھ آنے میں وی، پی ہوگا، جس میں سالنامہ سنہ ۵۳ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۱	فہرست مضامین اپریل سنہ ۵۲ء	شمارہ ۴

ملاحظات ---------- ۳
ادب لکاتب و الشاعر (افادات علی حیدر نظم طباطبائی) ---- ۹
طبقات فلک ---------- ۱۵
کیا اردو مرثیہ تقلیدی صنف ہے!... سید محمد عقیل ---- ۱۶
برج بابل ---------- سلطان احمد ---- ۲۸
آوارہ گرد اشعار --- پروفیسر عطاء الرحمن عطا کاکوی - ۳۳
زبان اور مارکسی فلسفہ --- ل - احمد ---- ۳۹
افادات حسرت موہانی ---------- ۴۱
یہاں وہاں سے ---------- ۴۴
آہنگ (نظم) --- فضا ابن فیضی اعظمی ---- ۴۷
غزل ---- نظر سیہوری ---- ۴۸
نوائے جرس (نظم) --- پروفیسر جمیل مظہری ---- ۴۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۱

ملاحظات

چند دن پاکستان میں

ہندوستان سے پاکستان جانا یا پاکستان سے ہندوستان آنا، کسی ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا نہیں ہے بلکہ ایک کرہ سے دوسرے کرہ تک جانا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر آیندہ کسی وقت زمین سے کسی دوسرے کرہ تک جانا ممکن ہوگیا تو بھی شاید ہمیں ان روح فرسا منازل سے نہ گزرنا پڑے گا جن سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان دوچار ہونا پڑتا ہے

اب میں سفر کی صعوبتوں سے بہت گھبراتا ہوں، اس کو تقاضائے عمر کہئے، یا ذوق تن آسانی، اس لئے باوجود اس کے کہ تقسیم ہند کے بعد میرے اکثر احباب و اعزہ پاکستان چلے گئے تھے اور ان سے ملنے کے لئے بیتاب و مضطرب تھا اور میں نے وہاں جانے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ لیکن اس سال جنوری میں اتفاقاً یا اجیاناً کراچی کی ایک تعلیمی کمیٹی کی طرف سے دعوت نامہ آگیا اور بہت سے وہ جذبات جنھیں عقل و مصلحت یا ضعف و کہولت نے اسوقت تک دبا رکھا تھا، دفعتاً بیدار ہوگئے اور آخر کار شوق کی بلندی میری "ہمتوں کی پستی" پر غالب آہی گئی

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ پاکستان جانے کے لئے پرمٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے بالکل بے خبر تھا کہ پرمٹ حاصل کرنا گویا ہفتخواں طے کرنا ہے اور اس کے بعد بھی ——— "جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا" ——— کی صدا ہر وقت کانوں میں گونجتی رہتی ہے

میں ۶ر مارچ کو کراچی پہونچا اور یکم اپریل کو وہاں سے واپس آیا۔ ان ۲۶ دنوں کے قیام میں، میں وہاں کیا کرتا رہا، کیا کیا

دیکھا اور کن کن حضرات سے ملا، اس کا ذکر شاید مناسب نہ ہو کیونکہ اس کا تعلق صرف میری ذات سے ہے اور اُس دنیائے محبت وخلوص سے واسطہ رکھتا ہے جس کی نزاکت غالباً اظہار و اعلان کو برداشت نہیں کرسکتی، لیکن مختصراً ان تاثرات کا اظہار غالباً بے محل نہ ہو جو عمومی طور پر فضائے پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں

ہرچند پاکستان نام صرف کراچی کا نہیں ہے (اور سچ پوچھئے تو آبادی کے لحاظ سے مشرقی بنگال کا ہے) لیکن چونکہ کراچی کو پاکستان کی فیڈرل حکومت کے مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے، اس لئے وہاں ہم کو تمام وہ عناصر ملجاتے ہیں، جو بہ حیثیت مجموعی ہمیں پورے پاکستان کے سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں اور گو میں نے ان حالات کے سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی تاہم بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر سمجھے ہوئے بھی سمجھ میں آجاتی ہیں اور غیر ذمہ دارانہ طور پر ان کے اظہار میں غالباً کوئی حرج بھی نہیں۔

سب سے پہلی چیز جسے میں نے بین طور پر محسوس کیا یہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک دوسرے کو غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں اور اس کا سبب صرف پرمٹ ہے۔ اگر دونوں ملکوں میں آمد و رفت کی وہی آسانیاں پیدا ہوجائیں جو پہلے پائی جاتی تھیں، تو شاید یہ بدگمانی کہ پاکستان میں کسی ہندو کی اور ہندوستان میں کسی مسلمان کی گنجائش نہیں ہے بہ آسانی دور ہوسکتی ہے اور رفتہ رفتہ دونوں ملکوں کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہوسکتے ہیں

کس قدر عجیب بات ہے کہ پاکستان کو خالص اسلامی حکومت سمجھا جاتا ہے حالانکہ اسلامی شریعت کے قیام کا وہاں امکان ہی نہیں اور ہندوستان کو کافرستان قرار دیا جاتا ہے درانحالیکہ یہاں بھی

یک کمر شایستۂ زنار نیست

نہ ہندوستان نامذہبی حکومت کے تصور کو اب تک صحیح معنی میں بروئے کار لاسکا ہے نہ پاکستان کا دعوائے حکومتِ اسلامی تعلیماتِ اسلام کے برکات سے لوگوں کو مستفیض کرسکا ہے اور اگر میری دعا قبول ہوسکتی تو میں خدا سے یہی التجا کرتا

بہ نیم غمزہ ہم ایں را رہائے وہم آں را

پاکستان پر چار سال کی مختصر مدت میں کئی دور آچکے ہیں، پہلا دور وہ جب تقسیم ہند کے بعد اسکی حالت بقول آتش ایک ایسی چوب خشک صحرا کی تھی —— "لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا"۔ یا پھر وہ جسے ہم "ہبوط آدم" سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں یہ بڑی سخت آزمایش و ابتلا کا دور تھا لیکن چونکہ قاید اعظم زندہ تھے اور مجاہدانہ جوش و ولولہ کی کمی نہ تھی، اس لئے پاکستان اس دور سے جلد گزر گیا اور اس کی بے بال و پری بڑی حد تک دور ہوگئی اسکے بعد دوسرا دور شروع ہوا جسے احتساب و تعمیر کا دور کہ سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ پاکستان اس دور سے پورا فایدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ ایک طرف وہ قاید اعظم کی رہنمائی سے محروم ہوچکا تھا اور دوسری طرف کشمیر کے مسئلہ نے زیادہ ناگوار تلخ صورت اختیار کرکے وہاں کے مالیاتی توازن کو درہم برہم کر رکھا تھا، تاہم اس نازک دور میں نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم نے جو کچھ کیا وہ بہت غنیمت تھا اور ان چند جذباتی غلطیوں کو چھوڑ کر جنھوں نے ان کو بعض اوقات بے قابو کرکے اپنی تقریروں میں نامناسب الفاظ کے استعمال پر مجبور کردیا، ان کا زمانۂ قیادت ہم کو بڑی بے لوث خدمت کا زمانہ نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی اس غلطی نے کہ وہ تقسیم ہند کے بعد ہی جلد از جلد کوئی دستور حکومت مرتب نہ کرسکا، نوابزادہ کے زمانۂ قیادت ہی میں وہ بے چینیاں پیدا کردی تھیں جو مختلف پارٹیاں پیدا ہوجانے کی وجہ سے لازماً رونما ہوجاتی ہیں، تاہم انھوں نے پاکستان کی ساکھ کو بڑی حد تک قایم رکھا اور اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو حکومت پاکستان کی موجودہ "رقیق حالت" جلد کسی پیکر و ہیئت میں تبدیل ہوجاتی۔ اس میں شک نہیں کہ "پراونشلزم" اور "ملّازم" وہ نوں ان کے زمانہ میں جنم لے چکی تھیں، لیکن چونکہ نوابزادہ کی ذات ان دونوں کی راہ میں ایک سنگ گراں کی حیثیت رکھتی تھی

اس لئے ان کا تخریبی پہلو بروئے کار نہ آسکا اور ان کا اقدام بڑی حد تک رکا رہا۔

نوابزادہ کے بعد پاکستان کا تیسرا لیکن بڑا اہم دور آیا ہے، اس وقت پاکستان نے ایک ایسے اکھاڑے کی صورت اختیار کرلی ہے، جس میں سندھ، مشرقی بنگال اور پنجاب تینوں صوبوں کی پارٹیاں اپنے اپنے اقتدار کے لئے زور آزمائی کررہی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جمہوری حکومتوں میں اس قسم کی کشمکش کوئی معیوب بات نہیں ہے بشرطیکہ اسکا تعلق محض آیڈیالوجی کے اختلاف سے ہو، نہ کہ صوبائی یا قومی نقطۂ نظر سے

ہندوستان میں بھی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتی ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ ہندوستان ایک کانسٹیٹوشنل حکومت ہے، وہ اپنا دستور بناچکی ہے، انتخاب کی منزل سے گزرچکی ہے اور اس کی مطلق العنان حیثیت باقی نہیں رہی، برخلاف اس کے پاکستان ایک Unconstitutional حکومت ہونے کی وجہ سے حزب مخالف کا وجود وہاں کوئی اساسی و بنیادی حیثیت نہیں رکھتا اور اس لئے وہاں نہ کوئی لیڈر شپ ہے اور نہ اسکی کوئی آواز۔ دور حاضر میں جمہوری حکومت کا تصور بھی کوئی آئڈیل چیز نہیں سمجھا جاتا چہ جائیکہ وہ آئین و دستور سے بھی بے نیاز ہو کہ اس صورت میں حکومت چلانا گویا ایک نہایت تیز دھار کی تلوار پر چلنے کی کوشش کرنا ہے۔

پاکستان میں صوبائی پارٹیوں کے علاوہ بعض مذہبی جماعتیں بھی ایسی اُبھر رہی ہیں جو عوام کی ذہنیت پر اثر انداز ہورہی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ اگر ان کے رہنماؤں کی جھولیاں بھر دیجائیں تو وہ بہ آسانی ختم ہوسکتی ہیں لیکن ان میں سے ایک ایسی بھی ہے جو "اندیشہ ہائے دور و دراز" کا باعث ہوسکتی ہے۔ یہ جماعت اسلامیہ ہے جو زیادہ منظم طور پر اپنا کاروبار چلارہی ہے۔ یہ جماعت کیا چاہتی ہے، اس کا کوئی واضح تصور اب تک سامنے نہیں اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ معلوم نہیں وہ کس وقت کس گوشہ سے، کس بھیس میں نمودار ہو جو یقیناً خطرہ کی چیز ہے

اس کا Slogan "حکومت الٰہیہ" ہے، لیکن یہ بجائے خود نہ صرف مبہم بلکہ گمراہ کن بھی ہے اور اس کو سُن کر ہمیں جنگ صفّین کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب امیر معاویہ کے سالار نے یہ کہکر کہ "قرآن ہمارا حَکَم" ہے، حضرت علی کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کردیا اور اسلام میں ایک نیا فتنۂ خوارج اُٹھ کھڑا ہوا

"حکومتِ الٰہیہ" کی تفسیر میں "شریعتِ اسلامیہ" کی اصطلاح بھی ان کی زبان پر آتی ہے، لیکن یہ صرف اس حد تک کہ "محمود و ایاز" ایک صف میں نظر آئیں، بلکہ تشریعی حیثیت سے ان حدود تک جن میں قطع ید رجم اور قصاص الف بالانف وغیرہ سب شامل ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو کسی وقت شدید تصادم کا باعث ہوسکتی ہے

اس جماعت کی تنظیم بڑی حد تک سوشلزم کے اصول پر قایم ہے، لیکن اس کے اندر ہم کو اس سوشلزم کے جراثیم نظر آتے ہیں جس نے ہٹلر کے زمانہ میں نازیت و فسطائیت کی صورت اختیار کرلی تھی

بہر حال جس حد تک مخالف پارٹیوں کا تعلق ہے پاکستان اس وقت بڑے اہم دور سے گزر رہا ہے اور حکومت کو ایک نہایت مضبوط پالیسی بناکر تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے خواہ اس کے لئے مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کو اپنے اختیارات خصوصی ہی سے کیوں نہ کام لینا پڑے

اندرونی مسایل میں اسوقت اہم ترین مسئلہ مہاجرین کو آبادی کا ہے اور بیرونی مسایل میں کشمیر کا جو وہاں کے بہت سے تعمیری منصوبوں میں حایل ہیں

مہاجرین کا مسئلہ اس میں شک نہیں بڑا دردِ سر ہے اور اگر اسوقت تک پاکستان اسے خاطر خواہ طے نہیں کرسکا ہے تو وہ قابل الزام نہیں۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ یوروپ کی سلطنتیں بھی آج تک ان چند ہزار مہاجرین کی آبادی کا

کوئی معقول انتظام نہیں کر سکیں جو پہلی جنگ عظیم میں خانماں برباد ہوئے تھے، چہ جائیکہ ہندوستان یا پاکستان جہاں مہاجرین کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اس میں اور کتنا اضافہ ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کراچی سے باہر دوسرے مقامات میں مہاجرین کی آبادی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں، لیکن جس حد تک کراچی کا تعلق ہے، حالات مایوس کن نہیں ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ مہاجرین کی صعوبتیں جلد دور ہو سکیں لیکن چونکہ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے اور اس کو روکنا قرین مصلحت نہیں اس لئے ضرورت ایسے انتظام کی ہے کہ وہ اپنی اہلیت کے لحاظ سے ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دئے جائیں اور کوئی مخصوص مقام ان کا مرکز نہ بنے پائے

پاکستان کے اندرونی مسایل میں مشرقی بنگال کے مسئلہ نے بھی حال ہی میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے اور آیندہ اس میں زیادہ نزاکت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اگر اس کے سلجھانے میں زیادہ بلند نظری سے کام نہ لیا گیا

کشمیر کا مسئلہ اس میں شک نہیں بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس کا حل بظاہر کوئی نظر نہیں آتا کیونکہ جنکے ہاتھ میں اسکا فیصلہ دیدیا گیا ہے، ان کے مصالح کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو برابر ملتوی کرتے جائیں

ان کے سامنے سوال نہ ہندوستان کی دوستی کا ہے نہ پاکستان کی حمایت کا بلکہ صرف اپنی مصلحت کا اور اس مصلحت کا تعلق صرف کمیونسٹ تحریک سے ہے۔ اگر چین میں اشتراکی حکومت قایم نہ ہوگئی ہوتی، اگر ملایا اور برما وغیرہ میں اشتراکی تحریک نہ پھیلتی، اگر ایران میں روس کے اثرات بڑھنے کا اندیشہ نہ ہوتا، تو کشمیر کا فیصلہ اب تک ہو چکا ہوتا، لیکن چونکہ حالات بالکل مختلف ہیں اور اشتراکیت امریکن بلاک کے لئے حد درجہ تشویشناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، اس لئے وہ کشمیر کا سودا اسی کے ساتھ کریں گے جو اشتراکیت کا مقابلہ کرنے میں ان کا سب سے زیادہ قوی حلیف ثابت ہوگا اور اس فیصلہ کا وقت شاید ابھی نہیں آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ ہندوستان و پاکستان دونوں سے یکساں توقعات قایم کریں اور اس طرح یہ "تماشائے جام و سنداں باختن" عرصہ تک قایم رہے

میں اس باب میں کوئی زیادہ کھلی ہوئی رائے نہیں دے سکتا، لیکن ہندوستان و پاکستان دونوں کی خدمت میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ وہ Heroic age جب جذبات کے لئے انسان اپنی جان دیدیتا تھا ختم ہو گئی ہے اب زمانہ عقل و مصلحت کا ہے اور بسا اوقات ہمیں تلخ گھونٹ بھی ہنس ہنس کر حلق سے نیچے اتارنا پڑتے ہیں

جس حد تک زرعی، صنعتی و اقتصادی ترقی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں پاکستان نے زندگی کا کافی ثبوت دیا ہے اور مستقبل میں بھی بہت سے امکاناتِ ترقی کی جھلک ہمیں نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک حد تک وہاں کی پبلک کا احساس بھی کام کر رہا ہے اور یہ بڑی امید افزا بات ہے۔ کیونکہ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ کراچی کی Intelligentsia میں جمود و تعطل نہیں ہے اور وہ کچھ نہ کچھ کرنا اور کرتے رہنا چاہتے ہیں، ان کی نگاہ ملک کی سیاست پر بھی ہے اور حکومت کے محاسن و نقایص پر بھی۔ لیکن چونکہ صحافت کو وہاں پوری آزادی حاصل نہیں ہے اس لئے اس عنصر سے کوئی فایدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

پاکستان کی سیاست خارجہ بھی اسوقت وہاں معرضِ بحث میں ہے لیکن اس سے دلچسپی لینے والوں میں بعض افراد تو وہ ہیں جو اپنے کھوئے ہوئے اقتدار پر ماتم کرنے کی بہترین صورت یہی سمجھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو موجودہ بین الاقوامی سیاست سے بالکل ناواقف ہیں، اسی لئے کبھی کبھی "پان اسلامزم" کی صدا کان میں آتی ہے اور کبھی کامن ویلتھ سے رشتہ توڑ کر اپنی ایک مستقل وحدت قایم کرنے کی، حالانکہ اصل چیز ہندوستان و پاکستان کا اتحاد ہے اور اس اتحاد کی راہ میں جو موانع حایل ہیں ان پر کوئی غور نہیں کرتا۔

میں یہاں تک ۔ چکا تھا کہ اخباروں کے ذریعہ سے یہ خبر سننے میں آئی کہ :-

"خوا ناظم الدین صاحب وزیر اعظم نے پاکستان اسمبلی میں فرمایا کہ اگر کشمیر کے مسئلہ میں معمولی گفتگو سے کام نہ چلا تو وہ کسی اور زبان میں گفتگو کریں گے"

اس میں شک نہیں بڑی زور دار بات ہے، لیکن باوجود زور دار ہونے کے اتنی چھوٹی بات ہے کہ اتنے بڑے آدمی کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی

خواجہ صاحب نے جس زبان کا ذکر کیا ہے اس سے مراد یقیناً "زبانِ شمشیر" ہی ہو سکتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا مخاطب کو ، ہے۔ اگر خواجہ صاحب کا خطاب "ارباب لیک سکسس" سے ہے تو ان کے لئے اس سے زیادہ خوشخبری اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ

جو تیری خو ہے وہ ہی مرا مدعا ہوا

وہ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آئیں اور انھیں ایشیاء میں اپنی شاطرانہ چالیں چلنے کا موقع ہاتھ آئے لیکن اگر معاملہ

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

کا ہے تو خواجہ صاحب کو یہ تقریر کرنے سے قبل سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اگر یہی بات ہندوستان کے وزیر اعظم کی طرف سے کہی جاتی تو کیا پاکستان اس سے ڈر کر دعوائے کشمیر سے دست بردار ہو جاتا اور اگر خواجہ صاحب کا مقصود اس تقریر سے محض اپنے اہلِ ملک کی اخلاقی قوت میں توانائی پیدا کرنا ہے، تو بھی اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس سے قبل بارہا یہ تدبیر اختیار کی جا چکی ہے اور اس معاملہ میں کسی مزید اقدام کی ضرورت نہ تھی۔ بڑے آدمی کی تقریر خواہ وہ یکسر جذباتی ہی کیوں نہ ہو، ہمیشہ "عہد و پیمان" ہی سمجھی جاتی ہے اور کسی عزم و ارادہ کا بار بار اظہار اس کی استقامت کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے

میں اس سے قبل بارہا عرض کر چکا ہوں اور اپنے اس عقیدہ پر نہایت سختی کے ساتھ قایم ہوں کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و حلیف بن کر رہیں، ان کی جغرافی پوزیشن، ان کے اقتصادی تعلقات، ملی جلی آبادی کا تعلق گوشت و ناخن کا سا تعلق ہے اور آج نہیں تو کل گوشت و ناخن ہی کی طرح ایک ساتھ مل جل کر انھیں رہنا ہے

مانا کہ کشمیر کا مسئلہ بڑی سخت گتھی ہے، لیکن کیا اس سے ہٹ کر اتحاد کے مسئلہ پر غور نہیں کیا جا سکتا، اگر آج کشمیر صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے تو کیا پاکستان و ہندوستان کے تعلقات بدستور ناخوشگوار رہیں گے اور پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کشمیر کی صرف ۴۰ لاکھ کی آبادی کے لئے ہندوستان و پاکستان کی ۴۰ کروڑ آبادی کو تباہی و بربادی کی آگ میں جھونک دینا کس حد تک جایز ہو سکتا ہے

وقت کا اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں نہایت خلوص و خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دست مصالحت بڑھائیں اور چند اصولی مسایل پر متفق ہو کر اس بات کا عہد راسخ کر لیں کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل کبھی صف آرا نہ ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان و پاکستان نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے اس عہد سے کبھی نہ ہٹیں گے تو نہ صرف یہ کہ کشمیر وغیرہ کے تمام متنازع فیہ مسایل از خود بہ آسانی حل ہو جائیں گے، بلکہ بین الاقوامی سیاست پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑے گا اور امریکن بلاک جو "آستیں میں دشنۂ پنہاں" لئے ہوئے ایشیا کی اعانت و ہمدردی کا دم بھر رہا ہے اپنا نقد نظر

بدل دینے پر مجبور ہوجائے گا

پاکستان بعض اوقات اس وہم میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ ہندوستان اس کا دشمن ہے اور اس کی طرف سے حملہ کا ہر وقت امکان ہے، لیکن پاکستان کو سمجھنا چاہئے کہ اس کا وجود اپنی جگہ ایک ایسی پایدار حقیقت ہے جس کو دنیا کی کوئی قوم نظر انداز نہیں کرسکتی، یہاں تک کہ اگر آج ہندوستان میں مہاسبھائیوں کو حکومت ہوجائے تو بھی وہ پاکستان کے الحاق کی جرأت نہیں کرسکتے، چہ جائیکہ موجودہ کانگرس حکومت جس نے ہمیشہ پاکستان کی آزادی کا خیر مقدم کیا ہے

پاکستان میں کبھی کبھی کسی جماعت کی طرف سے یہ آواز بھی کانوں میں آجاتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کامن ویلتھ کے ہاتھ فروخت کردیا ہے، اور وہ خود اپنی کوئی سیاست خارجہ نہیں رکھتا، لیکن معترضین شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ آج روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ساری دنیا سے کٹ کر اپنی مختص المقام سیاست قایم کرسکے اور دوسرے ملکوں کی امداد کی احتیاج اسے باقی نہ رہے

آج امریکہ کی زبردست قوت سے کون ناواقف ہے، لیکن اس کی سیاست خارجہ کی بنیاد بھی اس اصول پر قایم ہے کہ وہ یوروپ و ایشیا میں زیادہ سے زیادہ ملکوں کی ہمدردی حاصل کرسکے اور اس مقصد کے لئے وہ اربوں ڈالر خرچ کررہا ہے امریکہ کے مقابلہ میں دوسری قابلِ ذکر حکومت روس کی ہے اور وہ بھی چین، جاپان اور حدود ترکستان کی ریاستوں کی ہمنوائی حاصل کرنے کے لئے کچھ کم مالی قربانیاں نہیں کررہا ہے، اس لئے اگر پاکستان اپنے آپ کو کامن ویلتھ یا امریکن بلاک سے علٰحدہ کرلے تو بھی اسے کسی دوسرے بلاک میں شامل ہونا پڑے گا جو روس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا اور صنعتی، تجارتی، اقتصادی و جغرافی ہر حیثیت سے پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ امریکن بلاک میں شامل رہے۔ کیونکہ اول تو پاکستان کی سرزمین اشتراکیت قبول کرنے کے لئے ہنوز ناہموار ہے اور دوسرے یہ کہ اگر امریکہ و روس میں کسی وقت جنگ ہوگئی تو پاکستان روس کا ساتھ دیکر تباہی و بربادی سے نہیں بچ سکتا

پاکستان کی سب سے زیادہ دُکھتی ہوئی رگ مشرقی بنگال ہے اور اس باب میں اسے غیر معمولی احتیاط اور نہایت دانشمندانہ قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے

مشرقی بنگال آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا بڑا ٹکڑا ہے اور اپنے ذرایع پیداوار کے لحاظ سے بھی بہت قیمتی چیز ہے، لیکن پاکستان کا یہ جسم اس کے دل و دماغ سے اس قدر دور جا پڑا ہے کہ دونوں میں ربط و اتصال آسان نہیں ہے اور اس لئے مشرقی بنگال کے ڈفنس کے لئے پاکستان پر غیر معمولی بار پڑ رہا ہے جس کا برداشت کرنا ناگزیر ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مشرقی بنگال کی سرحد برما سے ملی ہوئی ہے اور اس کے شمالی حصہ "اراکان" میں مسلم آبادی بہت زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کی ہمدردیاں اراکان کے مسلمانوں کے ساتھ کسی وقت ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں اور وہ اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم اُٹھائے۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ برما کی اشتراکی جماعت کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج ہوگا جس کے ردِ عمل کو پاکستان مشکل سے برداشت کرسکے گا، خاصکر ایسی صورت میں کہ مغربی بنگال خود بھی بڑی حد تک اشتراکیت کی طرف مایل ہے اور بنگال کے ان دونوں حصوں کے کلچرل تعلقات ایسے نہیں کہ وہ دو مختلف راہیں اختیار کرنے پر مجبور کئے جاسکیں۔

بہرحال پاکستان اس وقت نہایت فیصلہ کن دور سے گزر رہا ہے اور اگر دستور جلد طیار نہ ہوا تو بھی اسے کوئی نہ کوئی آئینی قدم جلد اُٹھانا پڑے گا خواہ وہ انتخاب کی مہم کی صورت میں ہو یا اس شکل میں ہو کہ براہ راست گورنر جنرل کے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیکر کوئی مفید و مضبوط پالیسی متعین کریں۔

ادب الکاتب والشاعر

(افادات علی حیدر نظم طباطبائی)

دہلی و لکھنؤ کی زبان کا فرق

میر محمد حسین صاحب آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کروں ہوں اور مروں ہوں کو دہلی میں بھی عرصہ سے غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ پھر ایک جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اساتذۂ دہلی کے کلام میں آئے ہے۔ جائے ہے اکثر دیکھا جاتا ہے مگر اخیر کی غزلوں میں انھوں نے اسی طرح کروں ہوں اور پھروں ہوں یا تم آؤ ہو، جاؤ ہو، ہم کھائے ہیں اور پئے ہیں لکھا ہے یہ سب محاورے غیر فصیح ہیں مگر دلی کی زبان پر باقی ہیں۔ مثلاً ریاض الاخبار گورکھپور میں دلی کی آئی ہوئی ایک غزل شایع ہوئی تھی کہ مصنف اس کے ذوق مرحوم کے نواسے ہیں اس کا مطلع یہ ہے:-

کیے ہے برق تجلی لٹا لٹا کے مجھے، یہی ہیں دیکھنے والے نظر اُٹھا کے مجھے

مگر بقول آزاد اکثر اب یہی ہے کہ اہلِ دہلی اپنے شعر کو اس سے بچاتے ہیں اور عجب نہیں کہ اس کا سبب یہ ہو کہ اہلِ لکھنؤ کا کلام کثرت سے دیکھا اور سُنا تو اس کا یہ اثر پڑا۔

نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا سانس اور فکر کا لفظ دلی میں مذکر ہی بولتے سُنا، مگر استاد ذوق نے جب سانس کو نظم کیا، مونث نظم کیا اور یہی فرمایا کہ میر کی زبان پر بھی یہ لفظ مونث ہی تھا اور مرزا غالب نے بھی مجھے ہدایت کی ہے کہ فکر کو مونث ہی نظم کیا کرو، اس سے یہ ظاہر ہے کہ قدما کے جو الفاظ لکھنؤ میں باقی رہ گئے ہیں اہلِ دہلی اس میں تذکیر و تانیث کا تصرف کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

لکھنؤ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے محاورہ میں بہت نازک فرق ہے، مثلاً ہندو کہتے ہیں (مالا جپی اور پوجا کی) اور مسلمان کہتے ہیں (مالا پہنا اور پوجا کیا) یہی فرق قدیم سے چلا آتا ہے، میر حسن کہتے ہیں:-

وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے، رہیں دل جہاں سر پٹکتے ہوئے

مگر اب دلی میں مالا اور پوجا مونث بولا جاتا ہے۔ مرزا غالب مرحوم کی تحریروں میں میں نے محاورۂ لکھنؤ کے خلاف چند الفاظ دیکھے اس کے بارے میں نواب مرزا خاں داغ صاحب سے تحقیق چاہی انھوں نے لکھدیا یہ غلط ہیں مثلاً دایاں ہاتھ کہنا چاہئے چھٹویں تاریخ غلط چھٹی صحیح ہے، ان کا اُردو غلط ان کی اُردو کہنا چاہئے، کرسی پر سے کھسل پڑا خلاف محاورہ ہے۔ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے۔ اس کو بھی غلط کہا، اپنی اوقات کہنا چاہئے، میں نے ورے اور پرے کے باب میں بھی تحقیق چاہی کہا آپ لوگوں کی خاطر سے میں نے ان لفظوں کو ترک کر دیا، اس کے علاوہ بعض خاص محاورے دہلی کے مثلاً ٹھیک نکل جانا، پکھنڈ کرنا، ٹوپی اوڑھنا۔ مکان سجانا، پیترے کھولنا، جالا پورنا وغیرہ، مرزا داغ صاحب کے کلام میں اور قدمائے دہلی کے دیوانوں میں بھی نہیں پائے جاتے، غرض کہ جو لوگ دہلی

کے فصحا و نقاد مالک زبان و قلم ہیں ان کا کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ جب سے میر و سودا لکھنؤ میں آکر رہ پڑے، اسی زمانے سے دلی میں لکھنؤ کی آواز گونج رہی تھی، پھر انشاء اللہ خاں و جرأت کے کلام نے ان کی توجہ کو ادھر سے ہٹنے نہ دیا، ان کے بعد آتش و ناسخ کے مشاعروں نے متوجہ کرلیا بلکہ شاہ نصیر و ذوق کے کلام کا تو رنگ ہی بدل دیا۔ آخر میں میر صاحب کے مرثیوں نے خاص اور عام سب کی زبان پر اثر ڈال دیا، اسی زمانہ میں نواب مرزا شوق کی تینوں مثنویاں گھر گھر پڑھی جانے لگیں۔ امانت بھی انھیں دنوں میں اندر سبھا لکھکر اردو میں ڈراما کے موجد ہوئے، اس کے علاوہ نامۂ قلق اور واسوخت امانت اور شہروں کی طرح دلی کی گلیوں میں بھی لوگ گاتے ہوئے پھرنے لگے، یہاں تک کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً ایک ہوگئی۔ اس دعوے پر آزاد مرحوم کی شہادت کافی ہے، پانچویں دور کی تمہید میں لکھتے ہیں (اب وہ زمانہ آتا ہے کہ انھیں یعنی اہلِ لکھنؤ کو خود اہلِ زبان کا دعویٰ ہوگا، اور زیبا ہوگا جب ان کے اور دلی کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورہ کی فصاحت اور دلی کے عدم فصاحت پر دلایل قایم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض بعض نکتوں کو دلی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے ان بزرگوں نے بہت قدیمی الفاظ چھوڑ دئے جن کی کچھ تفصیل چوتھے دیباچہ میں لکھی گئی اور اب جو زبان دلی اور لکھنؤ میں بولی جاتی ہے وہ گویا انھیں کی زبان ہے اور میر مہدی کے اس مصرع پر ۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے ۔ غالب لکھتے ہیں:۔

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے، لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی لیکن ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں، اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبانوں کو اچھا کہے جاتے ہیں۔"

اب خیال کرنا چاہئے کہ میر محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہیں کہ اب جو زبان دلی و لکھنؤ میں بولی جاتی ہے وہ گویا ایک ہی زبان ہے اصل یہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی زبان دونوں جگہ بولی جاتی ہے جس کو دہلی کے تمام امراء و شرفا اپنے ساتھ لیکر لکھنؤ آئے تھے اور دلی میں گنتی کے ایسے لوگ رہ گئے تھے جو صاحب زبان تھے ان کی نسل پر بھی غیر قوموں کی زبان نے تو کم مگر لہجہ نے بہت اپنا اثر ڈالا اور اس کی کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔

لیکن لکھنؤ میں وہ زبان سب آفتوں سے محفوظ رہی یعنی زوالِ سلطنت واجد علی شاہ جنت آرام گاہ تک لکھنؤ کی زبان خاص دہلی کی زبان تھی اور ترقی کر رہی تھی اس سبب سے کہ چاروں جانب لکھنؤ کے صدہا کوس تک شہروں میں ملکی زبان اردو ہے اور گاؤں میں بھاکا مروج ہے، بخلاف دہلی کے کہ جن لوگوں سے دہلی دہلی تھی وہ لوگ تو نہ رہے اور غیر لوگ جو اطراف سے آئے اور آرہے ہیں وہ سب اہلِ پنجاب ہیں، اسی سبب سے دیکھئے غالب، میر مہدی کو فہمایش کر رہے ہیں کہ " دلی کی زبان کو لکھنؤ پر ترجیح نہ دو" اس کے علاوہ ذوق کے کلام میں زبان لکھنؤ کا تتبع پایا جاتا ہے مثلاً فکر کو ذوق نے مونث نظم کیا ہے، سانس کو بھی بتانیث باندھا ہے اس پر بھی بعض ناواقف کہ اٹھتے ہیں کہ دلی کی زبان لکھنؤ کی زبان سے بہتر ہے، دلی میں (نے) کا استعمال اب عجیب طرح سے ہونے لگا ہے۔ آزاد سے

طرّے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے   بالیں گیہوں کی وہ شملہ میں ہیں لٹکائے ہوئے

ایک جگہ قصص ہند میں لکھتے ہیں (تم نے مجھے بادشاہ سمجھا ہوا تھا)

جو بیچارے محض تتبع کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں تو اس طرح کا (نے) بہت افراط سے دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن ذوق و مومن و ممنون کا کلام ہمارے پاس موجود ہے، اس میں کہیں ایسا (نے) نہیں، حقیقت امر یہ ہے کہ لکھنؤ کی جو زبان ہے یہ دلی ہی کی زبان ہے۔ ۱۱۵۲ھ سے ۱۱۷۰ھ اٹھارہ برس کے عرصہ میں تین دفعہ دلی تاراج و برباد ہوئی وہاں کے لوگ فیض آباد و لکھنؤ

میں صفدر جنگ و شجاع الدولہ کے ساتھ آ بسے، پھر اس کے بعد ایک دلی کیا، تمام ہندوستان خاص مرہٹوں کا جولانگاہ ہوگیا لکھنؤ کے سوا کہیں امن نہ تھا یہاں آصف الدولہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے زمانے تک یہ زبان جلا پاتی رہی اور دلی میں غیر قوموں کے خلط نے یہ اثر کیا کہ لہجہ تک بدل گیا کہ اب پنجاب کے لہجے میں اُردو بولی جاتی ہے۔

ایجاز و اطناب و مساوات کی مثالیں

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اس شعر میں (کچھ غضب نہ ہوا) کثیر المعنی ہے اگر اس جملہ کے بدلے یوں کہتے کہ (مرا خیال کیا) تو مصرع میں اطناب ہوتا لطف ایجاز نہ ہوتا، یعنی اس "مجھ کو پوچھا، مرا خیال کیا" میں اطناب ہے، اور "مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی" میں مساوات ہے اور "مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا" میں ایجاز ہے، کیونکہ (کچھ غضب نہ ہوا) معنے زاید پر دلالت کرتا ہے۔ بظاہر تو اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ (کوئی بیجا بات نہیں ہوئی) لیکن ایک معنی زاید بھی اس سے سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ معشوق اس سے بات کرنا امر بیجا سمجھے ہوئے تھا یا اپنے خلافِ شان جانتا تھا، اور اس کے علاوہ یہ معنے بھی پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے دل میں معشوق کی بے اعتنائی و تغافل کے شکوے بھرے ہوئے ہیں مگر اُس کے ذرا بات کرلینے سے اس کو اب امید التفات پیدا ہوگئی ہے اور اُن شکووں کو اس خیال سے ظاہر نہیں کرتا کہ کہیں خفا نہ ہوجائے، اس آخری معنے پر فقط لفظ غضب نے دلالت کی، کہ اس لفظ غضب سے بوئے شکایت آتی ہے، اس کے دل کے پر شکوہ ہونے کا حال کھلتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر یوں کہتے کہ:-
"مجھکو پوچھا تو مہربانی کی" تو یہ جتنے معنے زاید بیان ہوئے اُن میں سے کچھ بھی نہیں ظاہر ہوتے (فقط مہربانی کی) میں جو معنے ہیں وہ البتہ نئے ہیں۔ اور اگر یوں کہا ہوتا کہ "مجھ کو پوچھا مرا خیال کیا" تو نہ تو معنے زائد پیدا ہوتے، کیونکہ (مرا خیال کیا) کے وہی معنے ہیں (جو مجھ کو پوچھا) کے ہیں۔

غرضکہ (مرا خیال کیا) میں لفظ نئے ہیں اور معنے نئے نہیں اس کے علاوہ اُن دونوں مصرعوں میں شرط جزا مل کر ایک ہی جملہ ہوتا ہے اور اس مصرعہ میں دو جملے ہیں اس سے ظاہر ہوا کہ اس مصرع میں کثیر اللفظ و قلیل المعنے ہونے کے سبب سے اطناب ہے اور مصنف کے مصرع میں قلیل اللفظ اور کثیر المعنے کے ہونے کے سبب سے ایجاز ہے اور جو مصرع باقی رہا اُس میں لفظ و معنے میں مساوات۔

اس جگہ یہ نکتہ بیان کردینا بھی ضرور ہے کہ یہ شعر مصنف کا ہے ؎

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز

مقام فہمایش میں ہے اور یہ دونوں شعر ؎

مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی، میں غریب اور تو غریب نواز

مقام شکر میں ہیں یعنے اُس شعر میں معشوق کو فہمایش کرنا مقصود ہے اور ان دونوں شعروں میں اُس کا ادائے شکر مقصود ہے غرضکہ اس کی غایت کچھ اور ہے اور اُن کی کچھ اور ہے۔ جب مقام میں اختلاف ہوا تو مقتضائے مقام بھی الگ الگ ہوگیا، لیکن اُن دونوں شعروں میں غایت ایک ہی ہے اور دونوں شعر مقام شکر میں ہیں اور مقام شکر کا مقتضے یہ ہے کہ ادائے شکر کرتے وقت احسان کو طول دے کر بیان کرنا حسن رکھتا ہے اور اس سبب سے جب مصرع میں اطناب ہے تو وہ مقتضائے مقام سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے بہ نسبت اس مصرع کے جس میں مساوات ہے یعنی اس مقام میں اطناب والا مصرع بلیغ ہے اور مساوات والا غیر بلیغ۔ دونوں شعروں کے مقابلے سے غرض یہ ہے کہ مقام اطناب میں مساوات ہونا حسن کلام کو گھٹا دیتا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب اور میر دونوں بزرگ اکبر آبادی ہیں یعنے زبان آنے کی عمر دارالسلطنۃ اکبر آباد میں گزری، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، غالب مرحوم کو لکھتے ہیں :-

"سابقاً مستقر الخلافہ اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود اکنوں دارالخلافہ شاہجہاں آباد بدیں نسبت غیرت افزائے صفاہان و شیراز"۔

خود غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"امجد علی شاہ کے آغاز سلطنت میں ایک صاحب وارد اکبر آباد ہوئے، میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے پھر وہ خدا جانے کہاں گئے، میں دلی آرہا"۔

میر محمد حسین آزاد، میر محمد تقی میر کو لکھتے ہیں :-

"باپ کے مرنے کے بعد (اکبر آباد سے) دلی میں آئے"۔

اور گلشنِ بے خار میں ہے :-

"میر از اہلِ اکبر آباد ست در بدو حال بہ شاہجہاں آباد آمد و تمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ مے گزرانید و مایحتاج از سرکار نواب وزیر الممالک بہادر می یافت ہم دراں جا بسیر ملک عدم شتافت"۔

اب اگر غالب کو دہلوی کہو تو میر کو لکھنوی کہنا ضرور ہے مگر اِن دونوں اُستادوں کی زبان یہ کہہ رہی ہے کہ نہ وہ دہلوی ہیں اور نہ یہ دہلوی ہیں اور زبان کا حال ایک لفظ سے معلوم ہوجاتا ہے زیادہ تفحص کرنے کی ضرورت نہیں، میر مرحوم کے سارے دیوان میں جا بجا اور کا لفظ طرف کے معنے میں ہے، حالانکہ دلی کی زبان میں یہ لفظ کبھی نہ تھا، مرزا غالب مغفور فرماتے ہیں :-

"ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے"۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :- "پارسلوں کا چھٹویں ساتویں دن پہونچنا خیال کرتا ہوں"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :- "پلنگ پر سے کھسل پڑا کھانا کھالیا"۔ حالانکہ ان کے معاصرین میں کسی کی زبان پر دلی و لکھنؤ میں یہ الفاظ نہ تھے۔ انصاف یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ زبان اکبر آباد کے لئے مایۂ فخر و ناز ہیں، دو ایک لفظوں کے نامانوس ہونے سے اُنکی زبان پر حرف نہیں آسکتا، غرضکہ قدر شناسی فن اور محبت وطن دونوں امر اس بات کے مقتضی ہوئے کہ غالب نے ناسخ کے ساتھ اس عقیدہ میں اتفاق کیا کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"۔ اسی طرح میر کی استادی کا آتش نے اعتراف کیا ہے ؎

آتش یہ وہ زمین ہے کہ جس میں شفیقِ من — سودا ہوا ہے میر سے استاد کی طرف

مرزا رفیع سودا جو ان کے معاصر ہیں وہ بھی اُن کی استادی کے مقر ہیں ؎

سودا تو اس زمین کو غزل در غزل ہی کہہ، — ہونا پڑا ہے میر سے استاد کی طرف،

معاصرین میں، ایک دوسرے کو مان جائے ایسا کم ہوتا ہے مگر میر بھی سودا کو مان گئے ہیں ؎

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت، معنے — گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ

اسی طرح ایک شعر آزاد سے نقل کیا ہے ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں — یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

مشہور ہے کہ سودا قصیدہ میں اور میر، غزل میں استاد ہیں، اُن کی غزل سست ہوتی ہے اور ان کا قصیدہ سست ہے، یہ بات حد تحقیق سے دور ہے۔ سودا کی غزل بھی ہرگز سست نہیں ہے البتہ میر سے غزلیں انھوں نے کم کہی ہیں اور قصاید بہت کہے ہیں اور میر کے قصیدہ کو سُست کہنا اس اعتبار سے غلط ہے کہ میر قصیدہ کہنا جانتا ہی نہیں دو تین قصیدے وہ بھی مختصر

انھوں نے کہے اور پھر بھی نہ کر سکے اُن کے قصیدہ کا یہ ایک شعر ہے :-

جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روزِ جزا — گرد کو اس کی نہ پہونچے گی کبھی اس کی اجل

مبالغہ پسند طبیعتوں کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن میرؔ کے رنگ کا یہ شعر ہی نہیں ہے بیشک غزل میں جو انداز میرؔ نے پایا ہے وہ کسی کو نصیب ہی نہ ہوا۔

ایک نکتہ یہ بھی یہاں افادۂ ادب سے خالی نہیں ہے کہ میرؔ و سوداؔ کو تمام اساتذۂ متاخرین نے مانا، اور یہ محض مضامین عالیہ کے سبب سے اور زبان کی بے تکلفی کے باعث سب کے دل پر نقش بیٹھا ہوا ہے اور اُن کی استادی میں کوئی کلام نہیں کرتا جن باتوں پر کہ اب دار و مدار استادی کا آرہا ہے وہ عروض سیفی اور غیاث اللغات کی صفحہ گردانی ہے اور یہ دونوں بزرگ محاورہ کے آگے نہ غلطی کی پروا کرتے تھے نہ قواعد کا خیال رکھتے تھے۔ آزادؔ نے کچھ ایسے اشعار لکھدئے ہیں۔ لیکن اکثر جگہ ان کی نظر نہیں پڑی، مثلاً میرؔ مرحوم فرماتے ہیں :- گزری نہ ایک دم بھی کہ قضیہ ہو انفصال — ع - تحت الثریٰ کو جائے مع اپنے ازدحام — ع گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا — ع - وہ یار کے کوچہ کا ہی کچھ شور و غلو سا — ع - حق صحبت نہ طیروں کو رہا یاد — ع - وارفتہ ہے گلستاں اُس روئے چمپئی کا — ع دھڑکے ہے جی قفس میں غم آشیاں سے — ع - اے جدِ پاک حضرت موسیٰ رضا امام - ع یاور علی محمد علی رہنما علی — سوداؔ کہتے ہیں :- تھا مستحق خوں مرا یا بہلا حنا — ع - راستی یہ ہے کہ ہجر لیے طویل القامۃ — ع - کب ہمیں اس چیز کی پروا یہ ہو وہ نہ ہو — ع - کیجئے جو اسیری میں اگر ضبط نفس کو (یعنے جو اور اگر دو حرف شرط) ع - تن پر اگر زبان ہو بجائے ہر ایک مو -

(۲) عینؔ اور ہ کا گر جانا - میرے عالم عالم مجھ پہ اس کے عشق میں تہمت ہے اب — ع - یہی حال ہمیشہ رہا تو مآل پر بھی نظر کرو - سوداؔ کہتے ہیں :- جو نقد جان بڑی قیمت تو دل بیعانہ تھا — اور ایک مصرع میر صاحب کا صاف ناموزوں ہے :-

ان درس گہوں میں ایسا آیا نہ نظر ہم کو — کیا نقل کروں خوبی اس چہرۂ کتابی کی

اے کی تی بہت جگہ گری ہے - میرؔ :- تم کو بیتا رکھے خدا اے بتاں -

(۳) غزل میں ہزل بھی اکثر ہے - میرؔ :-

بہکے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اُٹھا — واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

واعظ کو یہ جلن ہے شاید کہ فربہی سے — رہتا ہے حوض ہی میں اکثر پڑا مگر سا

باہم ہوا کرے ہیں دن رات نیچے اوپر — یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو خابا

میرؔ فقیر ہوئے تو اک دن کیا کہتے ہیں بیٹے سے — عمر رہی ہے تھوڑی اسے اب کیونکر کاٹیں ہم

اُڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے — مبادا مجھ کو بھی گڈا بتاوے

سوداؔ کہتے ہیں :- شیخ وہ رشتہ ہے زنار ہمارا جن نے — پھاڑ ڈالی ہے ترے سبحہ کے ہر دانے کی

خونِ جگر کا کھانا دل پر نہیں گوارا — اُن ترش ابروؤں کی جب تک نہ ہوئے چٹنی

(۴) نحو میں دھوکا کھانا میرؔ ے

اک شور ہو رہا ہے خونریزی میں ہمارے — حیرت ہے ہم تو چپ ہیں کچھ تم بھی بولو پیارے

یعنی ہماری کی جگہ ہمارے باندھا ہے، سوداؔ کہتے ہیں :-

آہ کس طرح تری راہ میں گھیروں کہ کوئی — سدِّ رہ ہو نہ سکے عمرِ علی جاتی کا،

عجیب ترکیب ہے۔ مینہ کا لفظ اس زمانہ میں قَبِع کے وزن پر ہے اور یوں ہی نظم بھی کرتے ہیں۔ مگر میر صاحب ہمیشہ اس لفظ کو

فاع کے وزن پر نظم کرتے ہیں - ۶ - " صبح تک جاتا نہیں ہے منہ آیا شام کا " ایک جگہ میر صاحب نے کہیں کے معنی پر کہوں نظم کیا ہے :- مت کر خرام - سر پہ اُٹھائے گا خلق کو بیٹھا اگر زمیں پہ ترا نقشِ پا کہوں

ہیگا اور ہیگی کے ساتھ تو ابھی تک (دگی) کو بول چال میں لگا رکھا ہے گو کہ شعرا نے ترک کر دیا لیکن میر کے کلام میں ایک جگہ (دگی) عجب طرح سے آیا ہے :-

تجھ سے دوچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے　　　پھر عمر چاہیئے گی اُس کو بحال آتے

(۵) میر صاحب شاعر معنی بند و استاد مضمون گو ہیں لیکن جب تناسب لفظی اور ضلع کی طرف جھکتے ہیں تو امانت لکھنوی و شاہ نصیر دہلوی کو مات کر دیتے ہیں :-

لوح سینے پہ مرے سو نیزۂ خطی لگے،　　　جنگی اس دل شکستہ کی اسی بابت ٹوٹے

اُس کے لبوں کے آگے کنہوں تنے نہ بات کی　　　آئی ہے کسر شہد مصفا کی شان میں

شان شہد کے چھتے کو بھی کہتے ہیں۔ ایک شعر میں یہ مضمون ہے کہ اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر بادام پیتا ہے۔ جیسے حافظ کہتے ہیں :- چو فندق پستہ اش خندد بحالم،　　　چرا بادام من گریاں نباشد

(۶) ردیف میں خلل :-

سیر کی اُٹھ کے ہم نے تا صورت　　　ویسی دیکھی نہ ایک جا صورت

(۷) قافیہ کے دھوکے :-

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے　　　کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

یعنی اختلاف توجیہ کا عیب اس مطلع میں ہے ایک جگہ تربت اور صحت کے قافیہ میں کہتے ہیں :-

" بے مت ہوئے بے ست ہوئے بے خود ہوئے میت ہوئے " ایک غزل میں قسمیں اور رسمیں قافیہ ہے اُس میں کہتے ہیں :- " دغا سے یہ بہتوں کے کھینچے ہے تسمیں " حالانکہ لفظ تسمہ کو جمع کریں تو بغیر نون کے تسمے جمع بنے گی۔

(۸) ایسی بندش کہ اُس میں کوئی رکیک پہلو نکلے شاعر کو اُس سے بھی بچنا ضرور ہے۔ میر کہتے ہیں :-

دریا تھا گر آگ کا دریائے دم عشق　　　سب آبلہ ہیں میری دروں میں صدف سے

یعنے مثل صدف کے آبلہ ہیں ۔

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۷۰۰ صفحات، مجلد قیمت نو روپیہ (للعہ) علاوہ محصول۔　　　منیجر نگار لکھنؤ

طبقاتِ فلک

(سائنس کی روشنی میں)

ہر وہ چیز جو حواس خمسہ کی دسترس سے دور ہوتی ہے، ہمارے لئے ایک طلسم زار بن جاتی ہے اور جو چیز جسقدر زیادہ نامعلوم ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ عجیب و غریب قیاس آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔

یوں تو سمندر بھی ہمارے لئے دنیائے عجائب و غرائب ہے، لیکن چونکہ وہ ہماری زمین ہی سے متعلق ہے اسلئے ہم کو بڑی حد تک معلوم ہوچکا ہے کہ اس کی گہرائیوں میں کیا کیا ہے، لیکن وہ چیز جسے ہم آسمان کہتے ہیں، ابتک ہمارے لئے نہایت گہرا سربستہ راز بنا ہوا ہے۔

جسوقت ہم رات کو لیٹتے ہیں اور آسمان میں بیشمار ستاروں کو جگمگاتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہمارے سروں پر جو یہ نیلے رنگ کا شامیانہ تنا ہوا ہے اسکی وسعت کا خیال کرکے حیران رہ جاتے ہیں، چنانچہ بلند پہاڑوں کی عظمت و تقدیس کا خیال عہدِ قدیم کے انسان کے دل میں اسی لئے پیدا ہوا کہ وہ انھیں آسمانی دنیا تک پہونچنے کا زینا سمجھتے تھے۔

قدیم یونان و روما کے لوگوں کا آسمان کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک آہنی برج یا قبہ ہے جسے اٹلس اپنے شانوں پر سنبھالے ہوئے ہے اور بادلوں کے دیوتاؤں کا مسکن ہے۔ کولمبس کے زمانہ کے باشندگان ملزکیو سمجھتے تھے کہ آسمان تعداد میں تیرہ ہیں اور تہ بہ تہ پائے جاتے ہیں۔ اب بھی وہاں کی ریڈ انڈین آبادی کچھ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ آسمان کے سات طبق ہیں۔ پانچ زمین کے اوپر اور دو زمین کے نیچے اور ان میں سے ہر ایک کا رنگ جدا ہے اور مختلف قسم کے جانوروں سے آباد ہے، اسوقت بیسویں صدی میں بھی بعض لوگ اسی قسم کے عقاید رکھتے ہیں، چنانچہ امریکہ کا ایک ظروف ساز چارلس فورٹ کا نظریہ یہ ہے کہ آسمان ایک بہت بڑی نیلی ڈھال ہے اور اس ڈھال میں بہت سے سوراخ ہیں جن سے اُس پار کی روشنی ستاروں کی صورت میں جھلکتی رہتی ہے۔

لیکن اب جدید تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ آسمان نہ چھت ہے نہ ڈھال بلکہ وہ ایک فضائے بسیط ہے جسمیں ایکہزار میل کی بلندی تک کم ازکم چار طبقات ضرور پائے جاتے ہیں۔ فضاء آسمانی کی تحقیقات کے سلسلہ میں تازہ ترین کوشش یہ تھی کہ ہیلیم گیس سے بھرے ہوئے پلاسٹک کے غبارے (سو، سو فیٹ کے) فضائے آسمانی میں اُڑائے گئے جو ۱۹ میل کی بلندی تک پہونچ سکے، (اس سے قبل ۳۵ء میں اسٹیونس اور انڈرسن صرف ۷۲۳۹۵ فٹ کی بلندی تک پہونچ سکے تھے) ان غباروں کے علاوہ، راکٹ طیاروں، ریڈیائی لہروں اور رصد گاہوں کی مدد سے بھی کام لیا گیا تو اسوقت تک آسمان کے صرف چار طبقات کا پتہ لگ سکا ہے۔

پہلا طبقہ جو زمین سے اوپر ۳۵ ہزار فٹ تک پایا جاتا ہے، بہت کثیف طبقہ ہے (کثیف سے مراد گندہ نہیں بلکہ زیادہ مادی اجزا رکھنے والا طبقہ ہے، جس میں انسان کے زندہ رہنے کا امکان ہے) چنانچہ جنوبی امریکہ میں ایک قوم ایسی ہے جو ۱۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پائی جاتی ہے اور ان میں دوسرے آدمیوں سے صرف اتنا فرق ہے کہ ان کے پھیپھڑے وہاں کی ہوا زیادہ لطیف ہونے کی وجہ سے بہت بڑے اور مضبوط ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی تک مزید آکسیجن حاصل کئے بغیر انسان زندہ رہ سکتا ہے اور اگر آکسیجن مہیا

ہوتی رہے تو ۶ میل کی بلندی تک، لیکن اتنی بلندی پر پارہ نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا ہے اس لئے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ چہرہ یخ بستہ ہو جائے اور ہوا کے تھپیڑے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، اسی کے ساتھ یہ بھی ہوگا کہ آپ کی قوت سماعت ختم ہو جائے گی اور آپ کی بلند سے بلند چیخ بھی سرگوشی کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

۴۵ ہزار فٹ کے بعد دوسرا طبقہ شروع ہوتا ہے جس کی وسعت ۶۵ میل ہے یہاں پارہ نقطۂ انجماد سے ۶۷ درجے نیچے گرا ہوا نظر آئے گا اور ہوا اتنی لطیف ہوگی گویا نہ ہونے کے برابر ہے، چنانچہ ۴۵ میل کی بلندی پر پہونچکر آپ کو نہ صرف یہ کہ آکسیجن کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہوگی بلکہ ہوا کا دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے اور منجمد کر دینے والی سردی سے بچنے کے لئے خاص قسم کے لباس کی بھی ضرورت ہوگی

اگر آپ ۵۵ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ جائیں گے تو پھر آکسیجن کی فراہمی اور لباس وغیرہ کا انتظام سب بیکار ہو جائیگا کیونکہ ہوا کا دباؤ کم ہو جانے کی وجہ سے آپ کے جسم کے اندر جو پانی کا حصہ پایا جاتا ہے وہ اُبھرنے لگے گا اور چند منٹ میں ایک غبارہ کی طرح آپ کی کھال پھول کر پھٹ جائے گی، لیکن اس دوسرے طبقہ کے نچلے حصہ کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ۲۰ سے ۵۰ میل کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہاں گرمی کی شدت ۱۱۰ درجے تک پہونچ جاتی ہے۔ اس گرمی کا سبب یہ ہے کہ یہاں کی اوزان (آکسیجن کی دوسری صورت) آفتاب کی ماوراء بنفسجی حرارت کو اپنے اندر جذب کرتی رہتی ہے اور قدرت کا یہ انتظام اسلئے ہو کہ آفتاب کی پوری گرمی زمین تک نہ پہونچے اور انسان زندہ رہ سکے۔

۴۰ میل کی بلندی پر شفقی روشنی کی حد ختم ہو جاتی ہے اور دفعتاً تاریکی آجاتی ہے، ۵۰ میل پر بہت سے روشن بادلوں کے ٹکڑے نظر آتے ہیں جنھیں نہایت تیز آندھی اِدھر سے اُدھر اڑائے پھرتی ہے۔

۵۰ اور ۷۰ میل کے درمیان دوسرا طبقہ ختم ہو کر تیسرا طبقہ شروع ہوتا ہے جس کی دبازت یا وسعت ۴۰۰ میل تک چلی گئی ہے۔ یہاں تاریکی ہی تاریکی ہے جس میں مختلف رنگ کی روشنیاں بجلی سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، اس طبقہ کے ابتدائی حصہ میں پارہ نقطۂ انجماد سے ۱۱۰ درجے نیچے گرا ہوا ہے، لیکن اس کے بعد گرمی بڑھنا شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ اوپر جا کر درجۂ حرارت ۴۰۰۰ ڈگری تک پہونچ جاتا ہے، اس حصہ میں ہوا کی رفتار بھی بہت تیز ہے اور ۴۰۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتی ہے۔ لیکن چونکہ حد درجہ لطیف ہے اس لئے اس میں طوفانی کیفیت نہیں پائی جاتی۔

۴۰۰ میل کے بعد چوتھا طبقہ شروع ہوتا ہے جو ۱۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے۔ یہ بالکل تاریک طبقہ ہے اور ہوا کے بہت زیادہ لطیف ہو جانے کی وجہ سے آواز کا وجود ختم ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر آپ کے کان کے پاس بندوق کا فیر کیا جائے تو آپ اس کی آواز نہ سُن سکیں گے۔ یہاں چھوٹے بڑے ہر طرح کے شہاب ثاقب نظر آئیں گے جن میں سے بعض ایک لاکھ ۱۰ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

ابھی تک انھیں صرف چار طبقات کا حال معلوم ہوا ہے لیکن اس کے بعد ۱۰۰۰ میل سے ماوراء کیا رنگ ہے اس کا علم ابھی تک کسی کو نہیں ہو سکا۔

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔

مینجر نگار لکھنؤ

کیا اُردو مرثیہ[1] تقلیدی صنف ہے!

آجکل اُردو ادب کے چند اُلجھے ہوئے مسایل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آیا مرثیہ تقلیدی صنف ہے یا غیر تقلیدی۔ کچھ لوگ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ مرثیہ تقلیدی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک غیر تقلیدی چیز ہے۔ مگر ابھی تک یہ بحث تو تو میں میں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ فریقین میں سے کسی ایک نے بھی ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کی ہے نہ صحیح طریقہ سے مرثیہ نگاری کا جایزہ لیا ہے اور یہ گتھی اُلجھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ان دو فریقوں کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی کسی طرح کھینچ تان کر منظرِ عام پر آجاتا ہے جو یہ مانتا ہے کہ مرثیہ، اُردو والوں کو فارسی اور عربی ادب سے ملا اور جو میر ضمیر تک اُسی لیک پر چلتا رہا! جس پر کہ فارسی اور عربی نے اُسے چلایا تھا۔ ان سب اُلجھنوں کا حل صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ہم مرثیہ گوئی کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا ایک عام جایزہ لیں اور دیکھیں کہ کون کہاں تک اپنے اعتقاد میں صحیح ہے اور کون کہاں سے غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے اس سلسلہ میں ہم جو کچھ بھی پیش کریں گے وہ مواد کے متعلق ہماری انتہائی جدوجہد اور تلاش تک محدود ہے۔

مرثیہ کی ابتدا کم و بیش عزاداری کی ابتدا ہے۔ کربلا کا واقعہ انسانی تاریخ کا وہ واقعہ تھا جس نے تمام بنی نوع انسان کو جھنجھوڑ دیا چونکہ یہ واقعہ اسلام کا واقعہ تھا اس لئے نتیجہ کے طور پر مسلمان نسبتہً زیادہ متاثر ہوئے۔ اور یادگار کے طور پر اس شہیدِ انسانیت کی بیش بہا قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے مجلسیں منعقد کرنے لگے جن میں ان کے مصائب کا تذکرہ کیا جاتا اور ان شہدائے کربلا پر وجد و ماتم ہوتا اور اس فعل کو عزاداری کا نام دیدیا گیا۔ اور وہ بیان جو ان مصائب کا حامل ہوا کرتا جب شعر کا جامہ پہن لیتا تو اُسے مرثیہ کہتے وہ خاص قسم کا مرثیہ جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔ واقعہ کربلا ۱۰ھ؁ ۶۱ کو دسویں محرم مطابق ۱۰؍ اکتوبر بروز جمعہ ظہور میں آیا۔ عزاداری پہلے عرب میں شروع ہوئی یا ایران میں ہمیں اس سے یہاں بحث نہیں مگر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عزاداری کے ساتھ مرثیہ کس طرح چلتا رہا اور کون کون سی صورتیں اختیار کرتا رہا۔

سب سے پہلا مرثیہ اس سلسلے میں جو ہمیں ملتا ہے وہ عربی میں حضرت زینبؑ خواہر امام حسین علیہ السلام کا ہے جو امام حسینؑ کی شہادت کے وقت حضرت زینبؑ نے پڑھا تھا ہم اس کے دو شعر پیش کرتے ہیں ؎

یا شمر ہذا کیفنا و عمادنا　　و ملاذنا من سائر الاسواء

دعنا نقبل نحرہ و نشمہ　　قبل الرحیل و قبل و جد فناء

(اے شمر یہ حسین ہمارے پشت پناہ ہیں اور تمام عزیز و اقارب میں صرف ایک یہی ذات ہے جو ہماری زندگی کا سہارا ہے مجھ کو اجازت دے کہ قبل رحلت و فنا کے گلوئے بریدہ کا بوسہ لے لوں اور سونگھ لوں)

یہ سب سے پہلا نوحہ تھا جو امام حسین پر پڑھا گیا۔ واقعات کربلا عربی میں پہلے پہل مقتل کی شکل میں لکھے جاتے تھے جیسے مقتل ابن یعقوبی

---

[1] اس مضمون میں مرثیہ سے مطلب وہی مرثیہ ہے جو واقعہ کربلا سے متعلق ہے جس میں حضرت امام حسین اور ان کے اعزا و انصار کی شہادت اور ان کے مصائب کا تذکرہ ہوتا ہے۔

مقتل ابن نما، مقتل عقبہ بن سمعان وغیرہ۔ ان سب مقتلوں کا نام مقتل الحسین ہوا کرتا۔ ان واقعات کے ضمن میں کہیں کہیں مصنف عقیدت اور جذبات سے متاثر ہوکر چار پانچ مصرعوں میں شہدائے کربلا پر رنج و تاسف کا اظہار کرتا۔ یہیں سے بس مرثیہ کی بنیاد پڑنے لگی مگر اسوقت حکومت کے خوف سے عزاداری کھلے بندوں نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ گھروں میں شخصی طور پر مجلسیں برپا کرتے تھے۔ حکومت بنی امیہ اسوقت برسرِ اقتدار تھی۔ بنو امیہ کے بعد بنو عباس کی حکومت آئی اور بنو عباس کے بادشاہ المتوکلین نے تو یہاں تک کوشش کی کہ قبر امام حسینؑ کا نشان تک مٹا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت میں عزاداری علی الاعلان نہ ہوسکتی تھی۔ اس لئے مرثیوں کی ترقی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دیلمیوں کی حکومت پہلی سلطنت ہے جس میں عزاداری کا علانیہ موقع ملا۔ معزالدولہ دیلمی پہلا دیلمی بادشاہ ہے جس نے عاشورہ کے دن امام حسین پر سینہ زنی کرنا لازم کردیا اور حکم دیا کہ اس روز تمام دکانیں بند کردی جائیں اور ان پر سیاہ جھنڈے لگائے جائیں[1] یہ وہ وقت تھا جب عباسی اقتدار کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ شاہان عباسیہ، دیلمیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں سب سے پہلے عزاداری بغداد میں کھلے طریقے سے منائی گئی۔ یہ وہ وقت ہے جب فارسی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اہل ایران کو فارسی میں بھی شاعری کرنے کی اجازت مل گئی تھی مگر ابتدائی شعراء حنظلہ، ابوالعلا، ابوالعباس کسی کے یہاں مرثیے نہیں ملتے۔ جب سلجوقیوں کی حکومت آئی اسوقت بھی عزاداری ہوتی رہی۔ سنجر سلجوقی کے زمانے میں مقامات حمیدی کے نام سے ابوبکر بلخی نے جو کتاب لکھی ہے اس میں عزاداری کا حال لکھا ہے مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ مصائب امام حسین نثر میں بیان کئے جاتے تھے یا نظم میں۔ صرف قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مصائب اشعار کی صورت میں بھی ضرور بیان ہوتے ہوں گے۔

فارسی زبان میں، نظم کی صورت میں واقعاتِ کربلا۔ جہاں تک ابھی معلوم ہوسکا ہے۔ سب سے پہلے سنائی غزنوی کی مثنوی حدیقۃ الحقیقہ میں ملتے ہیں۔ اس کے دوسرے باب میں "ذکر الحسین"۔ "صفت الکربلا" کے زیر عنوان بہت سے اشعار لکھے گئے ہیں جو مرثیے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس موقع پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو فارسی میں مرثیہ کی ابتدا پر شاید کچھ روشنی ڈال سکیں گے

پسرِ مرتضیٰ امیر حسین،	کہ چونے نہ بود در کونین،
دشمناں قصد جانِ او کردند	تا دمار از تنش بر آوردند
بدمشق اندر آں یزید پلید	منتظر بود تا سرش برسید
پیش بنہاد و شادمانی کرد	تکیہ بر دینی و امانی کرد،
شہر بانو و زینب گریاں،	ماندہ در فعلِ ناکساں حیراں
فاطمہ رویہا خراشیدہ	خوں بباریدہ بے حد از دیدہ
مصطفیٰ جامہ جملہ بدریدہ	علی از دیدہ خوں بباریدہ

ان اشعار میں مرثیت تو ہے اور واقعاتِ کربلا سے بھی متعلق ہیں مگر ان کو باقاعدہ مرثیہ نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ علٰحدہ مرثیہ نہیں لکھے گئے بلکہ ایک طویل نظم کا حصہ ہیں جن میں شاعر تاریخ اور جذبات سے متاثر ہوکر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔

تذکرۃ الشعراء، دولت شاہ سمرقندی کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایران کا پہلا باقاعدہ مرثیہ گو اور مرثیہ نگار شیخ حمزہ طوسی ہے جسے شیخ آذری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیخ آذری پندرھویں صدی عیسوی کا شاعر ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب ہندوستان میں دکن مرجعِ خلایق ہو رہا تھا۔ سلطنت بہمنیہ اپنے عروج پر تھی۔ دوسرے فارسی شعرا کی طرح شیخ آذری بھی ہندوستان آئے اور شاہی دربار میں ملازمت اختیار کی۔ احمد شاہ بہمنی کے حکم سے بہمن نامہ (تاریخ بہمنی) لکھنے کی خدمت ان کو تفویض ہوئی

---

[1] (ا) ابو الفدا۔ (ب) دول الاسلام مصنفہ ابو عبداللہ محمد ابن احمد ذہبی۔

تھی - شیخ آذری مرثیہ گو بھی تھے اور مرثیہ نگار بھی مگر ان کے مراثی اسوقت نایاب ہیں - مجالس المومنین مصنفہ قاضی نوراللہ شوستری میں یہ دو شعر اس تمہید کے ساتھ ملتے ہیں :-

" در مرثیہ حضرت امام حسین می فرماید"

سوراخ می شود دل ما چوں گل حسین　　ہر جا کہ ذکرِ واقعۂ کربلا رود
گر خلق را خدائے بگیرد بہ اولیاء　　ترسم کہ ایں معاملہ با انبیا رود

[1] آذری کے تذکرہ میں جہاں بھی ان کی مرثیہ نگاری کا تذکرہ ملا ہے ابھی تک یہی دو اشعار ہمیں ملے ہیں - اگر یہ واقعہ ہے کہ آذری بڑا مرثیہ گو تھا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مرثیہ گوئی کی بنیاد ہندوستان میں یہیں سے پڑی ہوگی - دکن میں مرثیہ گوئی کی ابتدا قریب انھیں وقتوں سے ہوتی ہے[2] - عجب نہیں کہ لوگ آذری سے متاثر ہوئے ہوں اور اس کی تقلید میں شروع شروع میں مرثیے لکھے گئے ہوں مگر جب آذری کے مرثیے ہمارے سامنے نہیں ہیں تو ہم قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ دکنی شعراء نے آذری کی تقلید کی ممکن ہے کہ دکنی مرثیے غیر تقلیدی ہوں اور آذری نے صرف محرک کا کام کیا ہو - ہم آذری کو اس لئے مرثیہ گو ماننے کے لئے طیار ہیں کہ اسوقت کی تاریخوں میں اس کا تذکرہ بڑی شان سے کیا گیا ہے اور محتشم کاشی وغیرہ کو جو آذری کے تبعین میں شمار کیا جاتا ہے -

یہ سب کچھ تھا مگر ان کو صرف منتشر عناصر سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی - بقول استاد محترم ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب • ترقی پسند عناصر منتشر حالت میں تو پہلے ہی سے موجود رہتے ہیں مگر ان کی شیرازہ بندی کر کے ایک رجحان پیدا کرنا، شاعر، ادیب اور ادب کی عظمت کا پتہ دیتا ہے - مرثیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا چنانچہ مرثیہ لکھنے کا عام رواج ایران میں صفوی عہد کے پہلے نظر نہیں آتا - صفوی شہنشاہوں نے امامیہ مذہب کے ایران کا قومی مذہب قرار دیا اور شاعروں پر تاکید کی کہ وہ فضائل آئمہ علیہم السلام و مصائب شہدائے کربلا کو نظم کیا کریں - اسی نظریہ کے تحت میں شاہ طہماسپ صفوی نے محتشم کاشی سے مرثیے لکھوائے - محتشم نے اپنے مرثیوں کو حسن کاشی کے ہفت بندوں کی بصورت میں لکھا - محتشم کے مرثیے زیادہ تر ترکیب بند کی صورت میں ہیں - محتشم کے ایک مشہور مرثیہ کا دوازدہ بند، سے ہم کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں ؎

در بارگاہِ قدس کہ جائے ملال نیست　　سرہائے قدسیاں ہمہ بر زانوئے غم است

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی مصنفہ اسکندر بیگ شاہ صفوی ۱۳۰ - بہ توسط استاد سید محمد ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی -

[2] محمد قاسم فرشتہ ۸۳۲ھ کے حالات کے ضمن میں آذری کا تذکرہ ہندوستان میں کرتا ہے - اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آذری کی وفات ۸۶۶ھ میں ہوتی ہے (تذکرہ دولت شاہ) اور آذری ۸۳۲ھ میں ہندوستان میں موجود تھا - اس لئے دکنی شعراء اگر تھے - تو ضرور آذری سے متاثر ہوئے ہونگے مگر ۹۸۸ھ کے قبل ہمیں ابھی تک کوئی مرثیہ نہیں ملا مگر یہ ناممکن ہے کہ ۸۶۶ھ سے لیکر ۹۸۸ھ تک لوگ خاموش رہے ہوں اسلئے کہ جیسے قلی قطب شاہ کی شاعری کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی شاعری نہیں ہے اسی طرح اسکے مرثیے بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ بالکل ابتدائی مرثیے نہیں ہیں - یہ بھی ناممکن ہے کہ سو برس تک لوگ عاشور خانوں میں فارسی کے مرثیے پڑھتے رہے ہوں جبکہ ان کی زبان دکنی تھی - قطب شاہ ہی کے زمانے میں مرثیوں کی اتنی تیز ترقی دیکھ کر یہ کیسے مان لیا جائے کہ سو سال تک لوگ خاموش رہے ہوں گے - نیز یہیں سے اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ مرثیہ پہلے شمالی ہندوستان میں ہمایوں کے ہندوستان واپس آنے پر شروع ہوا جس میں پہلے محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے - اس لئے کہ محتشم کا انتقال ۹۹۶ھ میں ہوا اور آذری ہندوستان میں ۸۳۲ھ میں آچکا تھا اور دکن میں بہت دنوں تک مقیم رہا - یہ کسی طرح مانا نہیں جاسکتا کہ آذری جو کہ زبردست مرثیہ گو تھا ہندوستان میں مرثیہ پڑھتا لکھتا نہ رہا ہو جبکہ وہ ایک شیعی سلطنت کا مہمان تھا جہاں عزاداری بڑے دھوم سے منائی جاتی تھی - ممکن ہے کہ یہ خیال پیدا ہو کہ معلوم نہیں شیخ آذری کے وقت میں دکن میں دکنی زبان رائج بھی تھی یا نہیں! مگر اسوقت دکنی اچھی طرح رائج ہو چکی تھی - نثر میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب معراج العاشقین ملتی ہے اور نظم میں نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم" منظر عام پر آچکی تھی -

جن و ملک بر آدمیاں نوحہ می کنند گویا عزائے اشرف اولاد آدم است

خورشید آسمان و زمیں نور مشرقین

پروردہ در کنار رسولِ خدا حسین

کشتی شکست خوردۂ مہمانِ کربلا در خاک و خوں فتادہ بہ میدانِ کربلا

از آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں خوش داشتند حرمتِ مہمانِ کربلا

بودند دام و درہمہ سیراب و می مکید خاتم زقحط آب سلیمانِ کربلا

آہ از دمے کہ لشکرِ اعدا نہ کردہ شرم کردند رو بہ خیمۂ سلطانِ کربلا،

آہ از دمے کہ باکفنِ خوں چکاں زخاک آلِ نبی چو شعلۂ آتش علم زنند

فریاد آں زماں کہ جوانانِ اہلبیت گلگوں کفن بہ عرصۂ محشر قدم زنند

پس برسناں کنند سرے راکہ جبرئیل

شوید غبار گیسویش از آب سلسبیل

قتل امام کے بعد اشقیا اہلبیت کو مقتل کی جانب سے لے جاتے ہیں۔ تمام اعزہ اپنے وارثوں اور عزیزوں کو دیکھ کر نوحہ و بکا کرتے ہیں ناگاہ حضرت زینب کی نظر جسم سید الشہدا امام حسین پر پڑتی ہے ان کا نوحہ و بین محتشم کاشی کی زبان سے سنئے:۔

ناگاہ چشم دخترِ زہرا دراں میاں، بر پیکرِ شریف امام زماں فتاد،

بے اختیار نعرۂ "ہذا حسین" زد سر زد چناں کہ آتش از آں در جہاں فتاد

پس بازبان پُر گلہ آں بضعۃ البتول

رو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول

ایں خشک لب فتادۂ ممنوع از فرات کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسین تست

ایں شاہ کم سپاہ کہ باخیلِ اشک و آہ خرگاہ ازایں جہاں زدہ بیروں حسین تست

محتشم کے بعد اور بھی بہت سے مرثیہ گو پیدا ہوئے ان میں سے حبیب کردستانی۔ خاکی شیرازی۔ راوندی وغیرہ کے نام اکثر تاریخوں میں نظر آتے ہیں مگر ان کے مراثی نایاب ہیں اور غالباً اس وجہ سے کہ وہ کوئی نئی بات پیدا نہ کر سکے۔

محتشم کے بعد اس فن میں جس پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ مقبل صفاہانی ہیں، مقبل کا اصلی نام محمد شفیع تھا وہ صفوی عہد کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ایران کے مشہور شعرا مرثیہ نگاری پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں بھی مرثیہ اس وقت اپنے پورے شباب پر تھا۔ شاہی۔ مرزا وغیرہ کے مرثیے تمام شمالی ہندوستان میں بھی پھیل رہے تھے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں مقبل[1] بھی اسی وقت ہندوستان آئے اور کچھ ایسا ہوا کہ سنہ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں یہیں گجرات میں پیوند خاک بھی ہوئے۔ مقبل نے تمام عمر مرثیہ گوئی کی

---

[1] واضح ہو کہ مقبل کے مراثی اُردو مرثیہ نگاروں کے کسی کام نہیں آسکتے تھے اسلئے کہ اسوقت سودا جیسا مرثیہ گو موجود تھا اور اُردو مرثیہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ مقبل کے مرثیے انکے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ سودا کی پیدائش ۱۱۰۰ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان طے ہوئی ہے۔ اور مقبل ہندوستان نادر شاہ کے ساتھ ۱۱۵۱ھ میں آتے ہیں۔ قائم چاندپوری کا بیان ہے اسودا ۱۱۱۹ھ سے لیکر ۱۱۲۲ھ تک کن میں بہادر شاہ کے ملازم رہے۔ ملازمت فوج کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ملازمت سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی ہوگی اگر قائم کا بیان صحیح ہے تو سودا کی پیدائش ۱۱۰۰ھ میں ہوئی۔ مقبل کی وفات ۱۱۸۰ھ میں ہوتی ہے۔ قائم کے لحاظ سے سودا اس وقت ۸۰ سال کے ہوں گے ظاہر ہے کہ اسوقت ان کی مرثیہ گوئی بھی پورے شباب پر ہوگی۔ اسلئے مقبل کے مرثیوں کا اُردو مراثی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جب یہاں کے مرثیے بالکل نئے راستے پر چل چکے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ وہ غم حسین کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس کا انھوں نے اکثر اشعار میں اشارہ بھی کیا ہے۔ مقبل کے مراثی کچھ تھوڑے سے موجود ہیں اور مرثیے ابھی تک شایع نہیں ہوسکے۔ کچھ مرثیوں کے قلمی نسخے پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہیں جو ابھی منظر عام پر نہیں آسکے۔ ہم ایک مرثیے سے، جو کہ پروفیسر موصوف کی عنایت سے ملا، کچھ موقعے نقل کئے دیتے ہیں جو فارسی مرثیوں کے ارتقاء پر روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت تک فارسی مرثیوں میں روایتیں نظم کی جانے لگیں تھیں اور فارسی میں قصّہ پن پیدا ہوچلا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سنتے چلئے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سوداؔ کی شاعری اپنے پورے عروج پر تھی اور ان کی عمر بھی ستاون سال کی ہوچکی تھی۔ سوداؔ مرثیہ لکھ رہے تھے اور مرثیوں کی خرابی پر بھی نکتہ چینی کرتے تھے جس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔ مقبل کے مرثیوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

روایت است کہ چوں گشت عازم میداں　　　بآرزوئے شہادت امام تشنہ لباں،
مخدرات تمامی بہ نوحہ و ماتم،　　　رواں شدند بہ دنبالِ آں امامِ امم
سکینہ برہمگی سبقت از شتاب گرفت　　　دو دیدہ شاہ جگر تشنہ را رکاب گرفت
دلِ شکستہ و اعضا بہ لرزہ چوں سیماب　　　خطاب کرد بہ سوئے پدر بچشم پُر آب

فارسی مرثیوں میں اب مکالمہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ مگر ابھی اُردو مرثیوں کی سی پختگی نہ آئی تھی۔ اُردو مرثیوں میں یہ سب چیزیں تقریباً سو برس پہلے سے موجود تھیں۔ مقبل کے مرثیے سے ایک موقع ملاحظہ ہو۔ امام حسین میدانِ جنگ میں جانے کو طیار ہیں حضرت سکینہ اور امام کی گفتگو دیکھئے:-

دلِ شکستہ و اعضا بہ لرزہ چوں سیماب　　　خطاب کرد بہ سوئے پدر بچشم پُر آب
براہِ گلشنِ فردوس گشتۂ سفری　　　تو میروی و مرانیست تاب بے پدری
تراکجے کہ تمنا کنم کجا جوئیم　　　پئے تسلّیِ خاطر پدر کرا گوئیم
بمن کسے ز تو دل گرم تر نہ خواہد بود　　　ہزار دوست یکے چوں پدر نہ خواہد بود

جناب سیدالشہدا کس طرح سکینہ کو تسکین دیتے ہیں ملاحظہ ہو:-

خطاب کرد بہ سوئے سکینہ آں سرور　　　بگریہ گفت کہ اے باغم آشنائے پدر
غمیں مباش کہ پروردگار یاور تست　　　جناب حضرت زین العبا برادر تست

بین ملاحظہ ہو۔ اس بین میں شاعر خود ہی محسوس کرتا ہے اور سب چیزیں افسوسناک طریقے سے خود ہی کہ جاتا ہے۔ بین پیش کرنے کے لئے اُردو مرثیہ نگاروں کی طرح کسی کردار کا سہارا نہیں لیتا۔ نہ بھائی بہن کی حالت پر بین کرتی ہے، نہ بیوی شوہر کی لاش پر بال بکھراتی ہے۔ شاعر خود ہی اپنے تاثرات کا اظہار سیدھے سادے طریقے سے کردیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

روایت است کہ در پیکرِ شہ ذی جود　　　ہزار و نہصد و پنجاہ و یک جراحت بود
نبود بر سر آں تشنہ کام غم خوارے　　　نداشت جز بدنِ پارہ پارہ دلدارے
کسے کہ خوں ز رخش شست اشک جاری بود　　　کسے کہ سوخت بآں زخمہائے کاری بود
فتادہ بود بہ ایں حال سبط پیغمبر　　　ستادہ بود بہ اطراف آں صفِ لشکر

یہ فارسی مراثی کا انتہائی عروج ہے جو آپ کے سامنے پیش ہوا۔ مقبل کے بعد جہاں تک علم ہے کوئی فارسی مرثیہ گو مرثیوں میں نئی چیزیں نہیں پیش کرسکا۔ اس طرح آپ فارسی مرثیہ گوئی اور اس کی تدریجی ترقی کا پورا نقشہ دیکھ چکے آیئے اب اُردو مرثیوں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کہاں تک اُردو مرثیوں نے فارسی مراثی کی تقلید کی اور کہاں سے الگ ہوگئے۔

ابھی تک جتنا اُردو ادب ہمارے سامنے آچکا ہے اس کا باقاعدہ جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ چاہے اُردو کی ابتدا دکن سے ہوئی ہو مگر اُردو مراثی کی ابتدا ضرور دکن سے ہوئی (پچھلے صفحات کی فٹ نوٹ ملاحظہ ہو جس میں یہ بات ثابت کیگئی ہے) دکن کے سلاطین بہمنیہ کا مذہب شیعی تھا جن کے دربار میں بہت سے شعرا موجود تھے جن میں عرب، عجم، ہندوستان تمام ملکوں کے مشہود شاعر، حسن گیلانی، شمس الدین سامی، ملا نظیری، شیخ آذری وغیرہ تھے۔ دکنی مرثیہ گویوں میں قلی قطب شاہ، وجہی، شاہی، غواصی، مرزا، کاظم وغیرہ گولکنڈہ میں اور ہاشمی، علی عادل شاہ، سیوا وغیرہ بیجاپور میں خاص مرثیہ نگار شاعر گزرے ہیں۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ پہلا مرثیہ گو شاعر ہاشمی ہے یا قلی قطب شاہ، بلکہ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اُردو مرثیے کس طریقے پر چل رہے تھے۔ قلی قطب شاہ اور وجہی تک مرثیوں میں دس بارہ شعر ہوتے تھے جن میں زیادہ تر بین اور بہت کم واقعہ نگاری یا کوئی باقاعدہ روایت نظم کی جاتی تھی شکل کے اعتبار سے وہی غزل کی صورت اور قصیدہ کی سی شان ہوا کرتی طرز بیان وہی محتشم اور حسن کاشی[1] جیسا ہوا کرتا تھا۔ قلی قطب شاہ[2] کا ایک مرثیہ ملاحظہ ہو:-

دو جگ اماماں دکھ تے جیو کرتے زاری وائے وائے — تن روں کی لکڑیاں جان کر کرتی ہیں خواری ہائے ہائے
آسماں چیچ جالا ہوا سورج الگن والا ہوا، — چندر سو جل کالا ہوا، دکھا یاری وائے وائے
قطبا کو ہے اللہ مددستا ہے اس دل میں خدا — تو منج مدد دے حیدر ولد پریاں کوں زاری ولئے وائے
یک پوت کوں دیتے زہر یک پوت پہ کھینچے خنجر — کافر کئے کیسے قہر یو زخم کاری وائے وائے
آؤ مل کر ماتمیاں سب اس غم ستے لہو روئیں — وا، اماماں، یا اماماں، یاد کر کر دل کھوئیں،
آہ ہمارے درد تے دریا کوں سب جوش آوتا — ماتمیاں کے لہو بونداں تے آگ سب بج جاوتا
فاطمہ دکھ ستے عرش کرسی تے انجھوا سیئے — ساتویں آسماں ہور، زمیں میں آگ بھڑکی اُٹھے

محمد قلی قطب کا ہمعصر وجہی بھی تھا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

حسین کا غم کرو عزیزاں — انجوا نین سوں بھرو عزیزاں
نبیاں والیاں کے انجواں سوں بھرے — یو غم حسین کا جنم دھو لایا
دلاں میں دو لگی جیوہ ستے چنگیاں — یو غم نے سلگا دھرک لگایا،
یو کیا بلا تھا، یو کیا جفا تھا، — مگر قضا تھا سو حق دکھایا
تمہارے وجہی کوں یا اماماں — نہیں تمن بن یو اس کوں سایا

یہ تھے مرثیے کے ابتدائی نقوش جو ہمیں ملتے ہیں۔ ان سے پہلے کے مرثیے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے۔ ان دو شاعروں کے یہاں کچھ تقلید ضرور ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آذری کی تقلید ہے یا محتشم کی۔ مگر فوراً ہی اتنی جلدی مرثیہ اپنا رُخ بدل دیتا ہے کہ اسکا احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ تقلید ہے یا محض حرکت کے لئے ایک ہلکا سا سہارا لیا گیا ہے۔ بہر حال اگر آپ زیادہ مصر ہیں تو مان لیجئے

---

[1] شیخ آذری کا نام یہاں اس لئے نہیں لیا جاتا کہ شیخ کے مرثیے ہمارے سامنے نہیں ہیں ممکن ہے کہ آذری کا بھی یہی طرز ہو، اگر مرثیے دستیاب ہو جاتے تو ہم اس طرز بیان کو آذری ہی کی طرف منسوب کرتے۔

[2] قطب قلی شاہ اور وجہی پر محتشم کاشی، آذری وغیرہ کا اثر ہو سکتا ہے مگر اتنی جلدی یہ اثر غائب ہوتا ہے کہ مرثیے کے پہلے دور میں غواصی کے یہاں بالکل تبدیلی ملتی ہے۔ محمد قلی قطب کی حکومت کا ابتدائی زمانہ اور محتشم کی زندگی کے آخری سال قریب قریب ایک ہیں۔ محمد قلی کی حکومت ٩٨٨ھ لغایت ١٠٢٠ھ رہی ہے۔ محتشم کاشی کا انتقال ٩٩٦ھ مطابق ١٥٨٨ء میں ہوا۔

کہ ان دونوں شاعروں پر وہ اثر موجود ہے۔ ویسے فارسی مرثیوں کی طرح یہاں بھی رونا رلانا ہی مقصد ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فنی طریقہ سے اس پر توجہ نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ سارا زور اسوقت مثنوی وغیرہ پر صرف کیا جاتا تھا۔ مگر یہ کیفیت اُردو مرثیوں پر زیادہ دیر تک قایم نہ رہ سکی بہت سے ایسے مرثیہ گو پیدا ہوگئے جنھوں نے اسے فنی طریقے سے اپنانا شروع کردیا اور بہت جلد اسے فارسی تقلید کے الزام سے بری کردیا۔ لطیف - شاہی - کاظم - مرزا وغیرہ نے مرثیوں میں وہ انفرادیت پیدا کردی جو فارسی اور عربی مرثیہ نگار اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی پیدا نہ کرسکے۔ دکن کے دور اول[1] میں خاص طور سے شاہی اور مرزا قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے مرثیہ کو بالکل ایک نئی زندگی بخشی۔ مرزا نے مرثیوں میں عنوانات قایم کئے اور طویل مرثیہ لکھنا شروع کیا۔ عنوانات میں لفظ "قصہ" شامل کیا، چنانچہ متعدد مرثیے قصۂ امام حسین (جس میں ۱۰۸ شعر ہیں) قصۂ حُرِ شہید (جس میں ۱۶۰ شعر ہیں) قصۂ حضرت قاسم (جس میں ۲۱۶ شعر ہیں) وغیرہ موجود ہیں[2]۔ مرزا نے واقعات کو بھی الگ الگ لکھنا شروع کیا۔ وہ حضرت علی اصغر کے حال کا مرثیہ، حضرت قاسم کی شادی۔ حضرت امام حسین کی پیاس، میدانِ قتال کی جنگ کا نقشہ، حُر کا امام کے پاس آنا وغیرہ سب کو الگ الگ نظم کرتا ہے۔ جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسوقت لوگوں میں مرثیہ کہنے اور لکھنے کا ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ اور صرف رونا رُلانا مقصد نہ تھا بلکہ واقعات کو مزین کرنا اور اس میں قصہ پن و تنوع پیدا کرنے کا بھی خیال آگیا تھا۔ کہیں کہیں حسب حیثیت ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ہونے والے واقعات زمان و مکان پر بھی اثر انداز ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ قتل کی رات کی تصریح اس طرح کرتے ہیں :۔

محنت قبل کی رات ہے اہلِ حرم پر گھات ہے — دل چور اس غم سات ہے تیرے فراقوں یا حسین
یو رات جگ غم ناک ہے عالم یو سب دیتاک ہے — پرخوں جگر غم چاک ہے تیرے فراقوں یا حسین

ایک مکالمہ ملاحظہ ہو مرثیہ 'قصۂ حضرت قاسم' میں دولہا دولہن کی گفتگو دیکھئے :۔

کہے دیکھو نہایت لگ یو ملنا ہے سو ساعت لگ — جدائی ہے قیامت لگ کہو یاراں صدا صد حیف
کہو بولو سو میرے تئیں کہ پھر دیدار اب تو نہیں — ملوں گا بھی تمن سوں میں کہو یاراں صدا صد حیف
وقت نہیں بات کہنے کا، گھڑی تک ٹھہر رہنے کا — سبب ہے رنج سہنے کا کہو یاراں صدا صد حیف
دیکھو غموں کے غم سوں اب ہوا ہے سب جگر خوں لب — رہے کیوں تاب مجھ کوں اب کہو یاراں صدا صد حیف

پھر حضرت قاسم کی جنگ ملاحظہ ہو ارزق شامی اپنے چار لڑکوں کے حضرت قاسم کے ہاتھ سے مارے جانے پر خود قاسم کے مقابلہ میں آتا ہے اس کی جنگ ملاحظہ ہو' ان نقشوں میں ایک بات ضرور ہے کہ شاعر نہ جزئیات سے کام لے پایا ہے نہ بیان پر وہ قدرت ہے جو بعد کے مرثیہ گویوں نے پیدا کی۔ یہاں دو حریفوں کا وہ جنگی کردار نہیں ابھر پاتا جو میرانیس وغیرہ کے یہاں آپ کو ملے گا مگر مرثیہ کے ابتدائی دور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اتنا بیان بھی بہت کافی ہے جو اس بات کا بھی پتہ دیتا ہے کہ شاعر میں یہ شعور کس قدر بیدار ہو چکا تھا۔ ملاحظہ ہو :۔

تب اس چاروں کے داغاں سوں دلِ ارزق ہوا پرخوں — اپنے آیا مقابل کوں کہو یاراں صدا صد حیف
تب اور بدبخت بے حرمت کیا قاسم پو کئی ضرب — ولے اس کو کہاں قدرت کہو یاراں صدا صد حیف
شجاعت کا تھا جو حد سو اس حد سوں شہ مسند — کئے سب ہاتھ اس کے رد کہو یاراں صدا صد حیف
غضب میں آ او شیرِ نر تب آ ارزق کے نزدیک آکر — کئے اک ہاتھ یوں اس پر کہو یاراں صدا صد حیف
سپر کو پھوڑ سر میں سوں گیا تیغ اس جگر میں سوں — ستے دو کر کرک میں کہو یاراں صدا صد حیف

---

[1] چونکہ ابھی تک اُردو ادب کی بہت سی چیزیں پردۂ خفا میں ہیں اس لئے ہم دور اول ۹۰۹ھ تک مانتے ہیں اسکے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ — [2] نصیر الدین ہاشمی

حُر کی آمد امام حسینؑ کے پاس ملاحظہ ہو :-

شَے کنے آئی اسوقت تازی سوں اور غازی اوتر
تب مبارک موں رکھے شہ کی رکاب پاک پر

اسوقت خوش حال ہو دل سوں شہِ دوجگ پناہ
پیار سوں رکھے مبارک ہاتھ حر کے سر پو شاہ

پنجۂ خورشید تھے دو جگ پو نور افشاں تمام
او مبارک ہاتھ یوں سر پو رکھے بولے امام

کون ہے تو مجھ منے اخلاص کی آتی ہے باس،
پیار سوں یوں چلیا آیا ہے منجے پر درد و یاس

حُر یو سن بولے ہے یوں لے سرورِ دنیا و دیں
میں ہوں اک تیرے محبّاں میں محبّ کمتریں

اس سبب آیا ہوں تا تجھ پر کروں یو جیو نثار
تجھ اوپر قرباں اچھو مردم جیواں کے لک ہزار

یو مرا مقصود ہے اے قرۃ العینِ رسول
جانفشاں تجھ پہ ہوں مَیں مج کوں محبت میں قبول

ایک مقام پہ امام حسینؑ کی جنگ کی طیاری ملاحظہ ہو :-

بندی دستار تب سرکار حسین سلطان رہبر کا
زرہ پہنی سو حیدر کا، کروزاری مسلماناں

سپر حمزہ کا لیتے ہیں ان پر زینب نے دیتے ہیں
حمائل بَر میں کیئے رہیں، کروزاری مسلماناں

لئے صمصام تب سرور سو شمشیرِ علی صفدر
ہوئے مستعد شیرِ نر، کروزاری مسلماناں

حُر ایک مقام پر اذنِ جنگ طلب کرتے ہیں۔ امام بہ حیثیت میزبان کے اپنے مہمان کو جنگ کی اجازت دینا گوارا نہیں کرتے، حُر کا اصرار جب بڑھتا ہے تو آخر میں امام اجازت دیتے ہیں :-

شَے جو یوں دیکھے کہ جو جھن کا ہوا حُر کا خیال
تب کہے لے حُر نجاؤ یوں شتابی سوں اتال

تک اگر مہمان منج سوں توں رہے تو خوب ہے
اسوقت لے حُر تیرا دیدار منجہ اپروپ ہے

تب یو سُن حُر یوں کہے لے ہر دو جگ کے آفتاب
اس سبب چلنے بدل اب قصد منجکوں ہے شتاب

تا اچھوں تیرے شہیداں میں یو میں اول شہید
اس شرف سوں حشر کوں سب میں اچھوں افضل شہید

خوش ہوئے سلطان سرور جب سنے حُر تے یو بات
تب دئے حُر کوں رضا او شہسوار کائنات

دکھنی مرثیوں میں جذبات نگاری ملاحظہ ہو۔ اقتباس حضرت قاسم کے حال کے مرثیے سے پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ ہاشم علی برہان پوری کی تصنیف ہے :-

جلوہ سے اُٹھ کے رن کو چلا تب کہی دولہن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھو بھرے نین

مت چھوڑ کے سدھارو تم اس حال میں ہمن
تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا

کیسی یو کد خدائی ہے کیسی ہے یو برات
آیا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات

گھر کوں نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات
دیکھا نہیں جمال کوں بھر کر نین مرا

اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کیوں رہوں
تجھ باج میں جہاں میں پھر امید کیا دھروں

جد کے مدینے کیونکہ میں اس ٹھار سے پھروں
تم اپنے سات لے کے دکھاؤ وطن مرا

قاسم کھڑا تھا روتے نین سن دولہن کی بات
غم ناک اپنا دیکھ کے دامن دولہن کے ہاتھ

تب آہ دردناک سوں بولا دولہن کے سات
اے بوستانِ راحت و سرو چمن مرا

منج کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار

میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار
حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا

ہے داغ دل میں تیری جدائی کا کیا کروں
نہیں ہے امید رن سے پھر آکر تجھے ملوں

جو کچھ ہوا ہے مقدروں میں راستی کہوں　　　وعدہ ہوا ہے حشر میں تم سوں رہن مرا

مرزا کے اس مرثیے میں اصغر کا غم قابل ملاحظہ ہے:-

کہوں دکدرد اصغر کا او نور چشم سرور کا　　　شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلماناں
عزیزاں دل ہوا پرخوں یوسن اصغر کے ماتم کروں　　　گئے معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلماناں
لگیا تیرا حلق بھیتر حسین سردار کے سینے پر　　　ہوئے معصوم شہید اصغر کرو زاری مسلماناں
دیکھے اصغر کوں شہ یوں جب چلیا غم سوں دریا تب　　　اُٹھا ڈیرے میں لائے تب، کرو زاری مسلماناں
ہوا تھا دل دکھوں پر خوں بلا کلثوم و زینب ل　　　کہے یوں شہر بانو سوں، کرو زاری مسلماناں
کہے اصغر کوں لایا ہوں اُسے کوثر پلایا ہوں　　　سو جنت میں سلایا ہوں، کرو زاری مسلماناں

ان اقتباسات کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ دکنی مرثیہ نگار جذبات نگاری اور کردار نگاری میں کوشاں تھے۔ حر کا اذنِ جنگ طلب کرنا اور امام کا اخلاق و انسانیت سے بعید جانکر اپنے مہمان کو اذنِ جنگ نہ دینا، ان کے کردار پر زبردست روشنی ڈالتا ہے پھر حضرت قاسم کی گفتگو اپنی دولہن سے، بالکل جیتے جاگتے نقشے ہیں جنھیں وہی درجہ حاصل ہے جو انیس و دبیر کے جذباتی مکالموں کو۔ یہ ضرور ہے کہ زبان اسوقت کی اتنی صاف نہیں ہے جتنی ضمیر، انیس و دبیر کی ہے۔ مگر اس کا ذمہ دار مرثیہ گو تو نہیں ہوسکتا بلکہ اس میں بہت کچھ دخل وقت، ماحول اور زبان کے ارتقائی منازل کا ہے اور یہی اثر ہے جس نے ضمیر، انیس و دبیر کے مرثیوں میں چار چاند لگا دیئے ورنہ خیالات کی رَو بہت کچھ ایک ہی جیسی ہے بعض اوقات انھیں باتوں کو پیشِ نظر رکھکر کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ ضمیر کا کام مجدّد سے زیادہ ایک ناظم کا ہے کہ انھوں نے ان بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کرکے ان کی شیرازہ بندی کردی اور اسی لئے انکا فخر و مباہات حق بجانب ہے۔ ورنہ ضمیر کی ایجاد بکھری ہوئی شکل میں پہلے سے بھی موجود تھی۔

اس کے بعد اب مرثیوں کی ہیئت کا سوال اُٹھتا ہے۔ اس میں شک نہیں جہاں تک مرثیوں کی ہیئت کا سوال ہے دکنی مرثیوں میں ہیئت کی کوئی قید نہیں تھی۔ مرثیے غزل کی صورت میں بھی لکھے جاتے تھے، مثنوی کی صورت میں اور مستزاد کی شکل میں بھی جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا بیانات میں اور زبان میں صفائی آتی گئی اور جسے آنا ہی چاہئے تھا شکلوں میں برابر تجربے جاری تھے۔ دور مغلیہ تک پہونچتے پہونچتے مرثیوں میں ایک زبردست تبدیلی ہوئی۔ مرثیہ مربع، مخمس اور مسدس ہی میں زیادہ لکھا جانے لگا۔ واقعہ نگاری اور جذبات نگاری بھی تیزی کے ساتھ ہونے لگی۔ اس دور کے مرثیوں کے ایک باقاعدہ مطالعہ کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرثیہ گو مرثیہ کو قصداً ایک نئے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے اور یہ کوشش عربی و فارسی مراثی میں کہیں نظر نہیں آتی۔ فارسی مراثی ۵ سو سال بعد بھی اس طرح کوئی نمونہ پیش نہ کرسکے۔ ان کے بین میں فردوسی کے بین (جب طامنہ سہراب کی خبر مرگ سنتی ہے تو کس طرح بیقرار ہوکر بین کرتی ہے) کی سی بھی کیفیت نہیں پیدا ہو پائی۔ یہی سب باتیں ہیں جو ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم یہ کہہ دیں کہ اُردو مرثیہ پر فارسی یا عربی مراثی کا اثر محض تحریک سے آگے نہیں بڑھتا ــــــ شکل سے ہم اُردو کے پہلے، دوسرے شاعر کو (جو ابھی تک معلوم ہوسکے ہیں) کھینچ تان کر مقلد کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر سودا اور خاص طور سے ضمیر کے دور میں تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس وقت مرثیہ کے خاص شکل۔ خاص طرز بیان اور مواد مقرر ہوگیا تھا جسے ارتقا نہیں بلکہ انقلاب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مرثیہ شکل کے اعتبار سے بالکل مسدس میں لکھا جانے لگا تھا حالانکہ مسدس کے مجدّد (مرثیوں میں) ضمیر نہیں ہیں۔ اُردو کا پہلا مرثیہ جو مسدس میں ہمیں ملتا ہے وہ مغلیہ دور میں دکن کے ایک شاعر تیم احمد برہانپوری کا ہے اس سے پہلے کوئی مرثیہ مسدس میں نہیں ملا۔

تیم احمد کا مسدس ملاحظہ ہو:-

حیف گھائل حسین تن تیرا　　　ستم پرخوں ہے پیرہن تیرا

تو کہاں ہو رکید حسرتن تیرا   کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا
نہیں ملتا بوند کس کتیں پانی
سخت طفلاں کے سر پہ حیرانی

تیم احمد کے بعد سودا کے یہاں مسدس میں مرثیے ملتے ہیں، ضمیر کے یہاں پہونچکر یہ ایک رجحان کی صورت بن گیا جس سے ہر پھر مرثیہ لکھنا گویا مرثیہ کی صنف سے الگ ہونا تھا اور پھر اسی شکل میں مرثیہ لکھنے پر اتنی پابندی رہی کہ دور جدید میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوسکی یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی نے بھی حسین اور انقلاب (اگر آپ مرثیہ مانیں تو) مسدس ہی میں لکھا گو طرزِ بیان بدل گیا۔
دکن میں مرثیہ گوئی کی بنیاد، اس کا ارتقا اور دکنیوں کی جدتیں مرثیہ کے میدان میں ہم دیکھ چکے اور یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ ان کی مرثیہ گوئی پر فارسی ہفت بندوں کا سوائے محرک کے اور کوئی اثر نہیں ہے۔ اس بیان کے ثبوت میں ہم فارسی اور دکنی مرثیوں کا ایک تقابلی مطالعہ بھی کر چکے آیئے اب شمالی ہندوستان کے مرثیوں پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالیں۔
شمالی ہندوستان کے مراثی کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اردو مرثیوں کے آغاز کا پتہ محمد شاہ کے عہد سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے پہلے جو مرثیے شمالی ہندوستان میں موجود تھے وہ دکنی تھے جو اورنگ زیب کے سپاہی دکن کی فتوحات کے بعد شمالی ہندوستان میں لائے تھے جیسا کہ قایم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ یہ مرثیے شاہ قلی خاں شاہی۔ تانا شاہ کے مصاحب و ندیم کے تھے چنانچہ قایم، شاہی کے متعلق لکھتا ہے:-

"سابق بریں پنجاہ سال ابیات و مرثیہ اش در بلاد ہندوستان دست بدست گردیدہ اند"[1]

میر حسن نے بھی شاہی کے متعلق یہی لکھا ہے:-

"بیشتر مرثیہ می گفت، در ولایت ہندوستان دست بدست می آوردند"

ان بیانات سے یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اس وقت تک شمالی ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا آغاز نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد جو مرثیے لکھے گئے، ظاہر ہے کہ وہ دکنی مرثیوں سے متاثر ہو کر لکھے گئے نہ کہ فارسی یا عربی مرثیوں سے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے ہمیں کسی مرثیہ گو کا نام نہیں معلوم ہوا البتہ اس عہد میں تین مرثیہ گویوں کا نام ملتا ہے۔ میاں مسکین اور ان کے دو بھائی حزیں و غمگین۔ ان مرثیہ گویوں کا کلام اب نایاب ہے مسکین کے ہم چند بند بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:-

جفا کے دشت میں جس دم گیا حسین غریب   اور اس کا نام فلک نے رکھا حسین غریب
جنگل میں با پسر و اقربا حسین غریب   شہید ہونے کو اترا رہا حسین غریب
قضا نے اس سے کہا فاطمہ کے بیٹے آ   یہ دشت سونا ہے تجھ بن اسے تو آکے بسا
زمیں نے تجھ کو بلایا ہے اس میں آکے سما   اور اپنا نام تو اس میں رکھا حسین غریب
اجل نے اس سے کہا فاطمہ کے ورثہ دار   تمھارا میرا ستاون برس کا تھا اقرار
قرار ہو چکا اب کھاؤ خنجر و تلوار   کہو اجل کے حوالے ہوا حسین غریب

ان مرثیوں کا مقصد رونا رلانا تو ضرور تھا مگر رونے رلانے کا مقصد بھی فارسی مرثیوں سے زیادہ موثر ہے۔ اتنا اثر فارسی مراثی میں پیدا نہیں ہوسکا تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو اس زمانے کے پورے پورے مرثیے نہیں ملتے ورنہ اس بیان کی تصدیق اچھی طرح ہو جاتی تاہم استدلال کے لئے ہم نواب درگاہ قلی خاں کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں جو اس وقت کے مرثیہ گویوں سے متعلق ہے:-

[1] تذکرہ مخزن نکات مصنف ۱۱۶۸ھ

"اہلے از استماع مرثیہ ہا گشتن بہ اسباب تعازی کی معد کہ از روضۃ الشہدا متصور نیست و نہ از مقاتل مقبل۔
قدرداں مراتب الم و چاشنی گیرانِ مائدۂ غم امتیاز می کنند"

کچھ تذکروں میں اس دور کے دو اور مرثیہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ ایک پسر لطف علی خاں دوسرا محمد نعیم۔ قائم نے اپنے تذ
میں ان کے علاوہ دو اور مرثیہ گویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک مراد علی قلی ندیم دوسرا میر محمد تقی (میر تقی میر نہیں) مگر یہ آخری دو مرثیہ گو
سودا کے ہمعصر تھے۔ سودا کے زمانے میں کثرت سے مرثیہ گو موجود تھے جن میں میر امانی اسد، سید محمد تقی، سکندر، میر تقی میر اور گدا خا
ہیں۔ گدا کے کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

جب آ کربلا میں وہ گردش کی ماری، بہو فاطمہ کی علی کی پیاری
گنوا بادشاہی، لٹا شہریاری چلی شام کو قید ہونے بچاری
فلک کو مخاطب کیا کاسے ستمگر تجھے کچھ بھی ہے شرم اے تیرہ اختر
نبوت کو ویراں کیا ظلم سو کر، اُٹھے میرے وارث کئی ایک باری
سناؤں سو کیا آگے غم کی کہانی کہ دل ہو گیا شرم سے پانی پانی
میں دیکھ کی تو کچھ بات کہکر نہ جانی زبان قلم بھی ہے لکھنے سے ہاری

سودا کے زمانے میں مرثیہ گو تو بہت سے پیدا ہو گئے تھے مگر مرثیہ گو زیادہ تر لوگوں کی عقیدت مندی سے بہت فایدہ اُٹھا
تے جس کی وجہ سے مرثیہ کی ترقی کچھ رک سی گئی تھی۔ اسی وجہ سے سودا نے ایک مقام پر لکھا ہے:۔

"لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"

سودا نے متعدد مقامات پر اس کی شکایت کی ہے مگر یہ ہماری بحث سے متعلق نہیں ہے۔ سودا کا زمانہ اور اس کے بعد کا
دور وہ دور ہے جس میں تقلید و غیر تقلید کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا صنف مرثیہ کے سوتے ملکر دھارا کی صورت اختیار کر چکے تھے
اور مرثیہ ایک ایسی شکل میں آچکا تھا جہاں اس نے اپنی زبردست انفرادیت پیدا کر لی تھی اور اُردو ادب کی ناقابل تقسیم پیداوا
بن چکا تھا۔

سید محمد عقیل

گوہر
(جناب نظیر جمیلی ایم ۔ اے کے قلم سے)

یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اس کے سوتیلے جوان بیٹے کی داستانِ معاشقہ ہے اور اس قدر دلچسپ انداز بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور۔ ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے
اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹی
کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مش
نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سندی حیثیت
رکھتے ہیں اور ۲۳۲ صفحات۔ کاغذ ۲۸ پونڈ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول
منیجر نگار لکھنؤ

مقالات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینے
اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ۔ منیجر نگار

برج بابل

(تحقیق کی روشنی میں)

برج بابل سے متعلق جو مختلف روایات پائی جاتی ہیں وہ بہت عجیب و غریب ہیں۔ اس باب میں اساطیری تصورات کی جھلک دنیا کے تینوں سامی مذاہب - صیہونیت، عیسائیت اور اسلام کی روایات میں یکساں نظر آتی ہے، لیکن قرآن پاک خاموش ہے۔

عبرانی روایت توریت کی کتاب پیدائش میں اس کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:-

"اور تمام زمین پر ایک ہی بولی تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک شنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے اور انھوں نے آپس میں کہا 'آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں' سو انھوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک ایسا برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہونچے اور یہاں اپنا نام پیدا کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین میں پراگندہ ہو جائیں، اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے کو اُترا اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہی ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا، سو آؤ، ہم وہاں جاکر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات کو نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے۔ اس لئے اس کا نام بابل ([illegible]) ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔"

تاریخی حیثیت سے اس بیان میں متعدد غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ توریت میں درج ہے کہ "وہ لوگ" جو مشرق کی طرف آئے اور زمین شنعار میں قیام پذیر ہوئے، اولادِ نوح میں سے تھے اور سیلابِ نوح کے بعد عرصۂ دراز تک کوہ ارات کے علاقہ میں رہنے کے بعد ہجرت کرکے شنعار میں پہونچے، لیکن یہ بات غلط ہے کہ انھوں نے اسے ویران و غیر آباد پایا کیونکہ وہاں پہلے سے کچھ لوگ آباد تھے اور یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں قدیم کلدانی مورخ بیروسس (Berosus) لکھتا ہے[ے] کہ "سرزمین بابل میں ابتدا سے غیر ملکی نسل کے کچھ لوگ آباد تھے جو کلدانیا میں آکر بس گئے تھے"۔ یہ لوگ کون تھے؟ اس کا جواب انیسویں صدی کے آخر تک تاریخ کے پاس نہ تھا لیکن جب دجلہ و فرات کی وادیوں میں کھدائیاں شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ سرزمین شنعار کے یہ قدیم باشندے جو اولاد نوح کے شنعار پہونچنے سے پہلے وہاں موجود تھے، در اصل تورانی تھے، قدیم ترین تورانی - جو اب موجودہ تحقیقات کے مطابق "اجداد اقوام" سمجھے جاتے ہیں۔

کتاب پیدائش میں بھی تحریر ہے کہ اولاد نوح نے شہر بابل کی تعمیر کی۔ حالانکہ حقیقت میں سرزمین شنعار کے یہ قدیم ترین باشندے

ے Chaldea صفحہ ۱۲۹ — ۵۲ کالڈیا صفحہ ۱۴۳

(جو موجودہ تاریخی اصطلاح میں شمیری اکاڈی (Shemeri Accadian) کہلاتے ہیں) شہر بابل کے معمار تھے اور انھوں نے ہی اسے آباد کرکے اس کا نام "تنترکی" (Tin-tir-ki) رکھا تھا جس کے معنی قدیم اکادی زبان میں "مقام ..." کے ہیں، اس کے بعد جب حمورابی اعظم نے غیر ملکی حملہ آوروں (یعنی تورانی النسل باشندوں) سے سرزمین کلدانیا کو پاک کرکے "اول کلدانی شہنشاہیت" کی بنیاد ڈالی تو "تن - تر - کی" کا نام بدل کر "کا۔ ڈمرآ" رکھا جس کے معنی "باب اللہ" کے ہیں اور یہی نام سامی زبان میں ترجمہ ہوکر "باب ایلو" یا "باب ایل" یا "بابل" ہوگیا کہلاویا۔ مصنفین کتاب پیدائش نے لفظ بابل کو عبرانی مصدر "بَبَل" سے مشتق سمجھا جس کے معنی پراگندہ کرتے کے ہیں۔

روایت برسوسس عبرانی روایت کا اصل ماخذ کیا ہے؟ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بھی قدیم اکادی اساطیر سے ماخوذ ہے۔ کلدانی مورخ بیروسس کی تاریخ کلدانیا سے اس واقعہ پر کافی روشنی پڑتی ہے اس میں درج ہے:

"پہلے باشندے اپنی طاقت پر حد سے زیادہ مغرور و متکبر ہوکر خود کو خداؤں سے بھی برتر و افضل سمجھنے لگے اور انھوں نے اس مقام پر (جہاں اب شہر بابل ہے) آسمان پر چڑھنے کے لئے ایک عظیم مینار بنانا شروع کیا لیکن جب اس عظیم و رفیع مینار کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہونچنے کے قریب ہوئی تو خداؤں نے چراغ پا ہوکر تند و تیز ہوائیں بھیجیں تاکہ تعمیر کردہ مینار مسمار و برباد ہوجائے اور مینار کو برباد کرنے کے ساتھ ہی ساتھ خداؤں نے اپنی طاقت سے کام لیکر ان کی زبانیں بدل دیں اور انھیں مختلف زبانوں کے بولنے پر مجبور کردیا۔[۱]"

اشوری روایت بیروسس کی اصل تاریخ کلدانیا تو ضایع ہوچکی ہے لیکن خوش قسمتی سے اس کے بعض اقتباسات بعد کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے جس سے مندرجۂ بالا حالات معلوم ہوئے، اس کے علاوہ اشور بن پال کی لائبریری کے ایک گلی تختی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس میں لکھا ہے کہ:-

"انسانوں نے اپنے ایک سردار (ایٹانا[۲]) کی سیادت میں جس کے دلی خیالات کفر کے تھے، کل خداؤں کے باپ رب اکبر سے روگردانی اختیار کرلی تھی انھوں نے بابل میں ایک اونچے ٹیلہ پر ایک برج یا فلک بوس مینار بنانا شروع کیا، لیکن خداؤں کے حکم سے ہواؤں نے رات کے وقت برج کو تباہ و برباد کردیا اور اس ٹیلہ پر چھوٹے بڑے تمام لوگوں میں گڑبڑی ڈالدی اور ان کی زبان بدل دی جس سے وہ ایک دوسرے کے مشوروں کو سمجھنے سے قطعاً معذور ہوگئے[۳]"

مندرجۂ بالا مختلف روایات مختلف ذرایع سے برج بابل کے متعلق ہم تک پہونچی ہیں مگر ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بابلی شہنشاہ بخت نصر (۶۰۲ ق-م) جس نے ہیکل بورسپ (برج بابل) دوبارہ تعمیر کرائی تھی ان روایتوں کے باب میں اپنے کتبہ میں کچھ بھی نہیں لکھتا۔

نمرود —— معمار برج؟ روایات برج بابل کا دوسرا معمہ اس کے معماروں کا ہے، لیکن چونکہ مشہور عبرانی مورخ جوزیفس نے نمرود کو اس مینار کا بانی قرار دیا ہے اس لئے اب تک مذہبی و علمی حلقوں میں عام طور سے اس کی تعمیر نمرود سے منسوب کی جاتی رہی ہے، حالانکہ نمرود کی تاریخی شخصیت بجائے خود ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے لیکن حالانکہ نمرود کی شخصیت یہودیوں اور عربوں کے نزدیک بڑی پرعظمت مانی جاتی ہے، یہاں تک کہ دجلہ و فرات کی وادیوں کے عرب باشندے

---

[۱] کالڈیا صفحہ ۲۱۲ — [۲] کالڈیا صفحہ ۳۲۰ — [۳] کالڈیا، مصنفہ زیناٸیڈ۔ اے۔ رگوزین صفحہ ۲۹۳ — [۴] باغی سردار کا نام کتبہ میں مٹ چکا ہے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ دوسرے بابلی کتبوں کا باغی Etana demi-god ہی اس سارے ہنگامے کا باعث تھا (امیر اس کے بادشاہ پجاری اور عوام) صفحہ ۸۳ — [۵] Assyria, its princes, ... مصنفہ پروفیسر ...H. Sayce

ہر تاریخی ٹیلہ یا کھنڈر اور بخت نصر کے تعمیر کردہ محلات اور دریائے فرات کے بند کے آثار کو بھی نمرود کے نام ہی سے منسوب کرتے تھے، بنابریں برج بابل کو بھی انھوں نے نمرود سے منسوب کر دیا۔

روایات کی عالمگیری قصۂ طوفانِ نوح کی طرح برج بابل کی روایات بھی کم و بیش ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں چنانچہ قدیم میکسیکو کے مایا (Maya) باشندوں کے عقاید میں قصۂ طوفانِ نوح کے ساتھ ساتھ روایت "اختلاف السنہ" اور "انتشار اقوام" نے بھی جگہ حاصل کر لی تھی اور اس سلسلہ میں قدیم مایا باشندوں نے اپنے ملک کے برج[1] "چولولا" کو کلدانیا کے برج بابل کی جگہ دے رکھی تھی اس روایت کے مطابق مشہور تھا کہ سیلاب عظیم سے بچ نکلنے والے سات دیوؤں میں سے ایک دیو نے آسمان پر چڑھکر اس پر حملہ کرنے کے لئے "چولولا" کا بلند برج تعمیر کیا مگر دیوتاؤں نے آگ لگاکر برج کو تباہ کر دیا اور معماروں کی زبان میں اختلاف ڈالکر انھیں منتشر کر دیا۔ قدیم ارمن روایات بھی ان عبرانی روایات سے بہت کچھ مماثلت رکھتی ہیں اس کے علاوہ نیپال کی ایک قبایلی قوم تھارو (جو منگول نسل سے ہے) اور استھونیا و اسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی اختلاف السنہ اور انتشار اقوام کی قسم کی روایت پائی جاتی ہے[2] ایک انگریز مشنری ڈاکٹر لونگ اسٹون کے بیان کے مطابق جنوبی مغربی افریقہ میں جھیل نگامی کے افریقی قبایل میں بھی اسی قسم کی روایت مشہور ہے[3]۔

مشرق کے دانشور... قدیم کلدانی ان بیانات کے بعد اب آئیے غور کریں کہ برج بابل کی حقیقت کیا ہے بات یہ ہے کہ دجلہ و فرات کی وادیوں کے قدیم تورانی النسل کلدانی باشندے کوکب پرست تھے اور اپنی تہذیب و ثقافت اور خصوصیت کے ساتھ ہیئت و نجوم میں بہت ترقی یافتہ تھے اور ان میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جو مذہبی پیشوا بھی تھا اور نجوم کا ماہر بھی۔ اس لئے جب ان کو رصدگاہوں کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے ہیکلوں اور معبدوں میں منارے بنانا شروع کئے۔ اس قسم کے ہیکل زگورت[4] کہلاتے تھے اور سب سے پہلے کلدانیا کے قدیم ترین مقامات اُر، لرسام اور اورخ میں تعمیر ہوئے[5]۔ ان ہیکلوں سے ملحق ایک لائبریری بھی ہوتی تھی اور ایک درسگاہ بھی جس میں دینیات و فلکیات کی تعلیم دیجاتی تھی۔

جدید زگورت مینار نما صورت کے ہوتے تھے اور مصر کے اہرام کی طرح مربعوں کی صورت میں ایک پر ایک بنائے جاتے تھے اور ہر اوپر کا مربع اپنے نچلے مربع سے چھوٹا ہوتا چلا جاتا تھا اور سب سے اوپر کے مربع پر ایک بلند برج تعمیر کیا جاتا جو "مقام مقدس" یا عبادت خانے کا کام دیتا تھا۔ یہ فلک بوس برج نما مینار، ان میناروں پر بیٹھکر رصدگاہ کا کام دیتے تھے اور یہاں سے ماہرین فلکیات نجوم و کواکب کی حرکات کا مطالعہ کرتے تھے۔

ہیکل بورسپ ــــ برج بابل ان ہیکلوں میں بورسپ کا "ہیکل ہفت برج" سب سے زیادہ عظیم و بلند اور پرشوکت تھا۔ یہ ہیکل قدیم اکادی کتبوں کے بیان کے مطابق "رب نبو" کے نام سے منسوب تھا[6]

---

[1] "The Ancient Maya" مطبوعہ مصنفہ Sylvanus Griswold Morley اس موضوع پر بہترین کتاب ہے اس میں کئی جگہ اس برج کا تذکرہ ہے اس برجِ عظیم کے آثار کو زمہ کے قدیم ویران شہر کے کھنڈرات کے قریب ایک ہسپانی سردار (Grijalva) نے ۱۵۱۸ء میں دیکھا تھا جو ایک دستہ کے ساتھ میکسیکو کے مشرقی سواحل پر سفر کر رہا تھا چنانچہ وہ اپنے بیان میں لکھتا ہے "..... ہم لوگوں نے ایک بہت ہی عظیم مینار کے آثار کو دیکھا...." اس شہر زمہ کے کھنڈرات اب "Tolum" کے نام سے مشہور ہیں صفحہ ۱۰۱ "قدیم مایا" ــ [2] "من و یزداں" مصنفہ علامہ نیاز فتحپوری حصہ اول صفحہ ۲۰۶

[3] Missionary Travels and Researches in South Africa صفحہ ۱۴ ــ [4] کالڈیا صفحہ ۲۳۳

[5] "اسیریا: اسکے بادشاہ، پجاری اور عوام" صفحہ ۴۰

جو علم ہیئت کا مربی خاص تھا - اس کی اصل اونچائی ۱۵۶ فٹ تھی - اس ہیکل کے کھنڈر ایک ٹیلہ کی صورت میں بابل کے کھنڈر سے ۸ میل کے فاصلہ پر ابھی تک موجود ہیں، یہ ٹیلہ گرد و نواح کے قریوں میں "برس نمرود" کے نام سے مشہور ہے اور یہی وہ ہیکل عظیم ہے جسے قدیم یہودیوں نے برج بابل کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا زمانۂ تعمیر بہت قدیم ہے لیکن کتنا قدیم ؟ ـــ اس پر بخت نصر کا دستیاب شدہ کتبہ بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا، لیکن پھر بھی اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا کہ اسے بخت نصر (۶۰۶ - ۵۶۱ ق-م) سے پہلے کے ایک "بہت ہی قدیم" بادشاہ نے تعمیر کرانا شروع کیا تھا لیکن تکمیل کرنے سے پیشتر مرگیا جس کے باعث برج کی تعمیر معرض التوا میں پڑگئی اور رفتہ رفتہ یہ بالکل برباد ہوگیا۔ سیکڑوں سال کے بعد بخت نصر نے ۶۰۰ ق-م میں بورسپ کے اس ہیکل کی - ٹھیک قدیم تعمیر کی جگہ پر دوبارہ تعمیر کی اور ایک کتبہ نصب کرایا جو اب دستیاب ہوچکا ہے، اس کتبہ میں برج کی ابتری کا بیان اس طرح درج ہے:-

"یہ ہیکل ہفت برجی یعنی مینار بورسپ، ایک قدیم بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا لیکن اس کے بالائی حصہ کو وہ اپنی زندگی میں مکمل نہ کرسکا۔ بہت قدیم زمانہ سے ابتری و مسماری کی حالت میں تھا۔ آب رسانی کے لئے نالیاں ٹھیک طور سے نہیں بنی تھیں، طوفانِ باد و باراں نے اسکی اینٹ چونے کو بہادیا تھا، چھت کی اینٹیں پھٹ گئی تھیں اور ساری عمارت کی اینٹیں بارش سے بہکر یا ٹوٹ کر ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی تھیں ......"

یہ حالت تھی برج بابل کی۔ جب بخت نصر نے اسے تعمیر کرایا لیکن ..... بدقسمتی سے بخت نصر کی دوسری عظیم تعمیرات کے ساتھ اس کا یہ نوتعمیر شدہ برج بھی برباد ہوگیا جس کے کھنڈروں کا ٹیلہ اب "برس نمرود" کے نام سے مشہور ہے

برج بابل کی عظمت و شوکت یہ ہیکل ہفت برجی سطح زمین سے چند فٹ بلند ایک کرسی (پلیٹ فارم) پر تعمیر کیا گیا تھا اور کرسی کو ملاکر اس کی بلندی خط عمود میں ۱۵۶ فٹ تھی اس کی بالائی چار منزلیں اسکی زیریں تین منزلوں کی بہ نسبت نیچی تھیں .... عمارت کی تزئین و آرایش زیادہ تر رنگوں سے کی گئی تھی اور ہر سیارہ کے لئے ایک خاص رنگ مقرر کر رکھا تھا۔

روایات برج بابل کی وجہ کتبۂ بخت نصر کے بیان کے مطابق جب اسے تعمیر کرنے والا بادشاہ اس کے بالائی حصہ کو مکمل کرنے سے پیشتر مرگیا اور امتداد زمانہ سے ہیکل ابتری و مسماری کی حالت میں پڑگیا تو بعد کے لوگوں نے یہ خیال قایم کرلیا کہ چونکہ بانیان برج نے اتنا عظیم و رفیع برج بناکر خداؤں کی شان میں گستاخی کی تھی اس لئے خداؤں کے غضب سے وہ برج کو مکمل کرنے سے پیشتر ہلاک کردئے گئے اور خداؤں کے حکم سے ہواؤں نے رات کے وقت برج کو برباد کردیا۔

اختلاف السنہ ۔ انتشار اقوام اب رہا معماروں کی زبان میں اختلاف ہونا اور ان کی روئے زمین میں پراگندگی ـــ سو اسکی اصلیت صرف اتنی ہے کہ:- یہ ارض کلڈنیا ہی کے میدان تھے جہاں سے مشرق قدیم کی متعدد مشہور قوموں نے، جو اپنی نسل و زبان کے اعتبار سے بالکل مختلف تھیں، منتشر ہوکر شمالی، مغرب اور جنوب کے ممالک میں بودوباش اختیار کی تھی اور اس انتشار سے قبل ان قوموں نے کلدانی میدانوں کے مشترکہ گہوارہ میں صدیوں تک پہلو بہ پہلو اور بڑی حد تک ... ایک اور صرف ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے اپنی اجتماعی زندگی بسر کی تھی یہ قومیں اپنی اس اجتماعی زندگی کے اس دور قدیم میں لسانی طور پر بھی آپس میں منسلک تھیں اور ... ایک اور صرف ایک زبان بولتی تھیں[۳]

---

[۱] کالڈیا صفہ ۳ سے [۲] "Five great monarchies of the ancient Eastern World" مصنف جارج راؤلنسن - جلد سوم میں یہ بیان صفحہ ۳۸۰ سے صفحہ ۳۸۰ تک ہے ـــ [۳] کالڈیا صفحہ ۲۹۲

اسی لئے کلدانی پجاریوں نے جو تاریخ قدیم ہی سے اچھی طرح واقف تھے، جب منہدم ہیکل کی وجہ تعمیر، اس کے معماروں کی بشی، خداؤں کے قہر و غضب کا نزول، برج کی تباہی وغیرہ کی افسانوی حکایات کی عوام میں اشاعت کی تو ساتھ ہی قدیم تاریخی ہقت کے پیش نظر ان حکایات میں "اختلاف السنہ" اور "انتشار اقوام" کے قصے بھی گھڑ کر شامل کر دئے تاکہ اگر ایک طرف احساس و نر کے لحاظ سے یہ افسانے مکمل ہو جائیں تو دوسری طرف برتر خداؤں کی قوت و اقتدار کا رعب بھی لوگوں پر طاری ہو جائے۔

روایات برج بابل اور توریت کلدانی خرافاتی ادب کی ان افسانوی حکایات نے توریت میں کس طرح جگہ حاصل کر لی؟ اس کا معلوم کرنا مشکل نہیں۔ برج بابل سے متعلق ان روایات نے ایک عوامی عقیدہ کی حیثیت سے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ یہودی عوام نے بھی جو سرزمین کلدانیا میں بود و باش رکھتے تھے ان روایات کو عقیدہ کے طور پر قبول کر لیا اور بعد میں عبرانی ادیبوں نے علاقہ جات بابل میں دورے کرتے ہوئے جب اس نصف مدفون شدہ منہدم ہیکل کو دیکھا اور اس سے منسوب کردہ عوامی روایات پر غور کیا تو اپنے مشاہدات اور عوامی روایات میں اتنی مماثلت پائی کہ ان کے ذہن نے فوراً اسے امر واقعہ کے طور پر قبول کر لیا۔

روایات کا غیر مستند ہونا اس موقع پر ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ یہ روایات صرف عام کلدانیوں اور نیچے درجہ کے پجاریوں ہی میں مشہور تھیں، خواص پر ان روایات کا اثر یا تو بالکل نہ تھا یا وہ انھیں زیادہ قابلِ وقعت نہ سمجھتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجودیکہ بخت نصر کے عہد سے سیکڑوں سال پہلے یہ روایات مشہور تھیں پھر بھی بخت نصر نے اپنے کتبہ میں ان روایات کا تذکرہ نہیں کیا۔

سلطان احمد

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

ناواقف لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اسکے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اس کو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر لحد تک عورت کی اور اسکی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ٹھیک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قایم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآنِ پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، چونکہ مالک رام صاحب عربی کے بھی فاضل ہیں اس لئے ان کی یہ کتاب ایک ایسے اسکالر کی ریسرچ کا نتیجہ ہے جو تقلید و اتباع سے بے نیاز ہے اور جو ہر استدلال و استنتاج میں خود اپنی مستحکم رائے رکھتا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

آوارہ گرد اشعار

اشعار کے غلط منسوب ہوجانے کی وجہ سے طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں - ہر دور کی زبان، قواعد کی ترکیبیں، محاوروں کا استعمال، متروکات کا انکشاف، غرض بہتیری باتیں ایسی ہیں جن کا مدار اشعار پر ہے، اور یوں بھی کسی کا حاصل کردہ سرمایۂ زندگی ہم خواہ مخواہ دوسروں کو کیوں بخشدیں۔ اس عنوان کی تحت میں ایسے اشعار لکھے جائینگے جو دوسروں کے ساتھ غلطی سے منسوب ہوگئے ہیں یا کردئے گئے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر آج ہم ایک شعر امیر خسروؔ کے ساتھ منسوب کردیں تو تذکرہ نگار اور اُردو زبان کے محققین کے لئے ایک دلچسپ باب کھل جائے اور اس غلط بنیاد پر کیسی کیسی بلند عمارتیں کھڑی ہوجائیں۔ یہ محض میرا قیاس ہی نہیں ہے بلکہ ایسی مثالیں موجود ہیں، صرف ایک صفیر بلگرامی ہی کو لے لیجئے۔ اللہ بخشے ان کی اس غلط بخشی کی بدولت اُردو شاعری کا سراغ کہاں سے کہاں جا ملتا ہے۔ ان غلط بخشیوں کی اصلاح نگر نہ کی جائے تو آگے جاکر یہ ایک خطرناک صورت اختیار کرلیں گی - اس مفید اور اہم سلسلہ کی ابتدا ہمارے صوبہ کے مشہور محقق اور وسیع النظر زباندان قاضی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا نے "معاصر" کے دورِ جدید کی پہلی کتابی قسط میں کی۔ یہ ایک مفید سلسلہ ہے، ملک کے ادبی سراغرسانوں کی توجہ اسکی طرف منعطف کی جاتی ہے، میری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ "نگار" میں قایم ہوجائے کیونکہ ملک کا یہی ایک واحد رسالہ ہے جسکی حیثیت صحیح معنوں میں اُردو کے "دائرۃ المعارف" کی سی ہے، آج کی صحبت میں آوارہ گرد اشعار کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں، انشاءاللہ یہ سلسلہ وقتاً فوقتاً قایم رہے گا۔

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

تذکرہ معرکۂ سخن میں بہ سلسلۂ "اعتراض بر کلام آرزو از سید نواب علی خاں گوہر" اس شعر کو میرؔ کی طرف منسوب کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے اور صاحبِ تذکرہ معرکۂ سخن (عبدالباری آسی) نے بھی میرؔ ہی کی طرف منسوب کیا ہے، پروفیسر بیدل عظیم آبادی نے بھی اپنے "اشعار میرؔ" میں نہ جانے کیوں اس کو میرؔ صاحب ہی کی طرف منسوب کردیا ہے - الیاس احمد صاحب مصنف "بہار" مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ نے بھی میرؔ ہی کا شعر سمجھا ہے، حالانکہ یہ شعر عظیم آباد کے ایک جوانا مرگ شاعر ضیا کا ہے جن کا انتقال ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء میں ہوا جو شوق نیموی کے ہونہار شاگرد تھے۔ ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے جو عرصہ ہوا میری نظر سے مولوی یعقوب مرحوم اوج گیاوی کی دوکان پر گزرا تھا۔ اور اپنچ مورخہ محرم ۱۳۱۹ھ (۱۲ر جولائی ۱۹۰۱ء) میں بہ عنوان "ضیا کی موت" ان کے دوسرے اشعار کے ساتھ یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے۔ ایک عظیم آباد کے نوجوان شاعر کے لئے اس سے بڑھکر فخر و مباہات کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس کے شعر پر میرؔ کے شعر کا دھوکا ہو۔

وہ کافر ہماری شبِ تار ہے
جسے دیکھنا مہرہ عار ہے

عام تذکروں میں یہ شعر مرزا محمد علی فدوی عرف بھچو شاگرد عشق عظیم آبادی و استاد راسخ کی طرف منسوب ہے مگر تذکرہ میر حسن میں

جوشش کے بھائی دل سے منسوب کیا گیا ہے جو یقینی غلط ہے کیونکہ گلشنِ ہند میں بھی جو گلزار ابراہیم کا اُردو چربہ ہے یہ شعر فدوی کے ساتھ منسوب ہے اور مصنف گلزار ابراہیم کا بیان ان کے عظیم آباد ہونے کی حیثیت سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیونکر   جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

یہ ایک مشہور شعر ہے جس کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ جسٹس محمود مرحوم نے اپنے ایک انگریزی فیصلہ میں اس کو نقل بھی کیا ہے، یہ شعر عام طور پر امیر مینائی کا سمجھا جاتا ہے اور ان کے دیوان طبع سوم ماہ جولائی ۱۸۹۲ء مطبع نول کشور کان پور کے صفحہ ۹۸ میں موجود ہے، یہی شعر بادنیٰ تغیر "بجائے کشتوں کا قتل" "احوال قتل" شاد لکھنوی کے دیوان "سخن بے مثل" صفحہ ۴ میں درج ہے۔ یہ دیوان خود شاد کی نظرثانی اور تصحیح کے بعد شایع ہوا ہے اس لئے بعد میں الحاقی صورت کی کوئی توجیہ بھی نہیں نکلتی۔

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا   زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

یہ شعر شاد عظیم آبادی کا ہے، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے میر سے استفادہ کیا ہو ؎

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے   زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

اور سجاد عظیم آبادی المتوفی (۱۱۰۳ھ) کا بھی ایک شعر اسی مفہوم کا ہے ؎

سینہ گھوٹے ہے غم ستی نکلے نہیں ہو جان بھی   ہائے زمیں بھی سخت ہے، دور ہو آسمان بھی

خیر یہ تو ایک ضمنی بحث ہو گئی، ہاں تو وہ شعر ہے شاد کا مگر فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون بہ "عنوان ریاض" میں جو ریاض نمبر نگار جنوری ۱۹۳۳ء شایع ہوا ہے اس شعر کو ریاض کو بخشدیا ہے اور خفیف "اصلاح" کے ساتھ ؎

"قیامت ہے بشر کے واسطے مجبور ہو جانا"

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں   وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

یہ شعر عام طور پر انشا سے منسوب ہے، شعر الہند صفحہ ۹۸ میں بھی انشاؔ ہی سے منسوب ہے مگر مصنف آبِ حیات اور انکی پیروی میں صاحب گلِ رعنا نے دونوں سے منسوب کر دیا تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ رہے۔ لیکن بہ حوالہ مضمون مصحفی از مخرمی محترم سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی مطبوعہ معارف، یہ شعر مصحفی کے قلمی دیوان سوم میں موجود ہے جو ان کی نظر سے گزرا ہے

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند   دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

اس شعر کا رنگ باعتبار مفہوم مصحفی سے ملتا جلتا ہے اس لئے میں نے اپنے ایک مضمون "میر اور راسخ کا تقابلی مطالعہ" مطبوعہ نگار ——— کے سلسلہ میں ضمناً اس شعر کو مصحفی سے منسوب کر دیا تھا حالانکہ یہ شعر قایم چاندپوری کا ہے اور میں انکی روح سے عذر خواہ ہوں۔

کئے اضداد ظاہر قدرتا معلوم ہو شئے کی   جہنم کے مقابل خلد جاویداں کیا پیدا

عبدالسلام صاحب ندوی نے شعر الہند جلد دوم صفحہ ۲۷۹ پر اس شعر کو حسن کے ساتھ منسوب کیا ہے، حالانکہ یہ شعر راسخ عظیم آبادی کا ہے اور ان کے مطبوعہ دیوان کے پہلے ہی غزل کا آخری شعر ہے۔ ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے۔

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم   ہے یہ میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں۔

اعجاز رسول خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد نے اپنے مقدمہ دیوان نوشاد میں اس شعر کو میر سے منسوب کیا ہے لیکن حقیقت میں یہ شعر قائم کا ہے۔

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخمِ عشق کو ٹانکے   اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجائے

عبدالسلام ندوی نے شعر الہند جلد اول صفحہ ۳۰ میں یہ شعر سراج سے منسوب کیا ہے، اور میر نے بھی نکات میں بیاض سید

سے یہ شعر سراج ہی کے نام سے نقل کیا ہے، لیکن میر کی ایک مثنوی ہے جو ۱۸۲۰ء میں لندن میں طبع ہوئی ہے، اس کا ایک نسخہ مجھے بذریعہ پرنسپل فضل الرحمٰن صاحب گورنمنٹ کالج مظفرپور دستیاب ہوا، اس کی جلد کے ساتھ کسی دوسری کتاب کا مطبوعہ ضمیمہ بھی منسلک ہوگیا ہے قیاس چاہتا ہے کہ شاید یہ ضمیمہ اُردو لغت مرتبہ ٹیلر کا ہے جس میں مرتب نے الفاظ کے استعمال کے اسناد اشعار سے دئے ہیں کسی دوسرے موقعہ پر اس مثنوی اور ضمیمہ کا ذکر ہوگا اس کا حوالہ "ضمیمہ لندن" کے نام سے ہوگا تاکہ ناظرین کو اُلجھن نہ ہو۔ ہاں تو اس ضمیمہ لندن میں متذکرہ بالا شعر سجاد اکبرآبادی کے نام سے منسوب ہے۔ سراج اور سجاد دونوں کے دواوین دسترس سے باہر ہیں مگر میرا یہ خیال ہے کہ چونکہ سجاد، آبرو کے شاگرد تھے اور طرز ایہام کے دلدادہ وہ ایسے ہی اشعار کہتے تھے:-

خط کترواکے آج قینچی سے ہم سے ملنے میں جائے ہے کترا

اس لئے اس کا امکان ہے کہ یہ شعر سجاد ہی کا ہو۔ سراج ان لفظی گورکھ دھندوں سے عموماً الگ رہتے ہیں ان کے اشعار اس طرح کے ہوتے ہیں:-

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں کہاں سراج کہاں آفتاب عالم تاب

تم پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے کیا خط و خال والے کیا صاف گال والے

لیکن پھر بھی میر کی شہادت کو ناقابل قبول ٹھہرانے کی کوئی معقول وجہ ابھی تک نہیں پائی گئی۔

خوب رو جب سے نظر آتا نہیں لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

نکات الشعرا میں یہ شعر سراج سے منسوب ہے اور بجائے خوب رو، شعلہ خو ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے یا میر صاحب کی حسب عادت اصلاح ہو، دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی سراج ہی سے منسوب کیا ہے مگر "ضمیمہ لندن" میں یہ شعر بادنیٰ تغیر ولی سے منسوب ہے اور تخلص کے ساتھ:-

خوب رو جب سے نظر آتا نہیں تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

ولی کا دیوان مارہروی میرے پاس موجود نہیں اس لئے نہیں کہ سکتا کہ یہ شعر اس دیوان میں ہے یا نہیں۔

اُٹھ چیت، اتنی کس لئے خاطر نجنت کی آئی بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

یہ شعر آبرو کا ہے مگر ضمیمہ لندن میں آرزو سے بھی منسوب کردیا ہے جو یقینی غلط ہے۔

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے کام عشاق کا تمام کیا،

کوئی عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

یہ شعر اشرف الدین علی خاں پیام کا ہے، جو میر کے ملاقاتیوں میں تھے اور ان کے بیٹے سلام سے میر کے دوستانہ تعلقات تھے، ساتھ شعر کہتے، چہلے ہوتیں، گپیں کرتے۔ میر نے متذکرہ بالا اشعار کو پیام ہی سے منسوب کیا ہے، مگر ضمیمہ لندن میں یہ دونوں اشعار میر کے ساتھ منسوب ہیں، بادی النظر میں یہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ خود مصنف اپنے اشعار کو دوسرے کے نام کیوں منسوب کرے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اشعار میر کے متداول دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں پوری غزل کے ساتھ، میرے پیشِ نظر میر کا مطبوعہ دیوان طبع اول نولکشور ۱۸۶۸ء ہے، دوسرے نسخوں میں بھی یہ اشعار پائے جاتے ہیں غلط فہمی اس بنا پر ہے کہ لوگوں نے اس کو میر کے اشعار سمجھے حالانکہ میر نے تضمین کی ہے اور پہلا شعر یہ لکھا ہے:-

ہوگیا دل مرا تبرک جب درد نے قطعۂ پیام کیا

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

تمھاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے　　کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

یہ شعر آبرو کا ہے اور نکات میں درج ہے۔ گلشنِ ہند میں یہ شعر یوں ہے :-

میاں کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے　　کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

اور نوٹ یہ دیا ہے کہ یہ شعر بادنیٰ تغیر جرأت سے منسوب ہے۔ آبِ حیات میں کریلا بھانڈ کی نقل کے سلسلہ میں یہ درج ہے کہ شاعر بھی اندھا، شعر بھی اندھا، مضمون بھی اندھا اور شعر یوں ہے :-

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے　　کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

اور نوٹ میں یہ دیا ہے کہ یہ شعر شاہ مبارک آبرو کا ہے۔ نقل کا سارا دارو مدار اس بات پر ہے کہ یہ شعر جرأت کا ہے۔ آزاد نے خود ہی ایک مصنوعی قلعہ بنایا اور خود ہی مسمار بھی کردیا۔ خیر یہ شعر چاہے آبرو کا ہو چاہے جرأت کا مگر اب تو یہ شعر کلیم الدین احمد کے نام سے ایسا چسپاں ہوگیا ہے کہ "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں اس اندھے شعر میں بینائی آگئی ہے۔ اور اس کے بال کی کھال نکالی گئی ہے۔

ہر صبح آئتا ہے تیری برابری کو　　کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

محمد یحیٰ تنہا نے مراۃ الشعراء میں یہ شعر انند رام مخلص سے منسوب کردیا ہے صفحہ ۱۵۲۔ حالانکہ متفقہ طور پر یہ شعر ہے آرزو کا لطف یہ ہے خود آپ ہی نے بغیر کسی نوٹ کے یہ شعر آرزو کے کلام کے ضمن میں بھی درج کیا ہے اور سب سے پہلا شعر یہی ہے ص۱۱۲

خط سے زیادہ اور ہوا حسن یار کا　　آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑا بہار کا[1]

نکات الشعراء میں یہ شعر عشاق کھتری کے نام سے منسوب ہے

مگر گلشنِ ہند میں یہ شعر بادنیٰ تغیر عبدالحیٰ تاباں سے منسوب کیا گیا ہے ع "سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا" اور اس غزل کے اور اشعار بھی دئے ہیں۔ بجائے اکھاڑا کے بگاڑا ہوتا تو رکاکت جاتی رہتی۔ مگر رعایت لفظی کا خون جو ہوجاتا۔

وعدے تھے سب خلاف جو تجھ لب سے ہم نے　　یہ لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا

یہ شعر نکات الشعراء میں سراج الدین علی خاں آرزو سے منسوب ہے لیکن گلشنِ ہند میں شاہ مبارک آبرو کے اشعار کے ساتھ مندرج ہے :-

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا　　چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

آبِ حیات صفحہ ۱۰۳ یہ شعر ناجی کے نام سے ہے۔ مراۃ الشعراء میں تنہا نے بھی صفحہ ۹۵ پر یہ شعر ناجی ہی سے منسوب کیا ہے اور بجائے 'کبھی' کے 'کبھو' ہے مگر گلشنِ ہند صفحہ ۲۶ پر یہ شعر آبرو کے تحت میں ہے اور پہلا مصرعہ یوں ہے ع

رکھے کوئی اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　　صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

نکات الشعراء میں یہ شعر شرف الدین مضمون سے منسوب ہے اور آبِ حیات صفحہ ۱۰۲ میں بھی ایک پر لطف لطیفہ کے ساتھ یہ شعر مضمون ہی سے وابستہ کیا ہے مگر پر لطف بات یہ ہے کہ عبدالباری آسی کے دو نایاب زمانہ بیاضوں کے انتخاب مطبوعہ ہندستانی اکیڈیمی کے صفحہ ۶۲ میں یہ شعر حشمت کے "نایاب" واسوخت کے چھبیسویں بند کا دوسرا شعر ہے۔ پورا بند یہ ہے :-

---

[1] اسی مضمون کا ایک شعر یوسف عظیم آبادی کا ہے جو اصالت خاں ثابت کے بھانجے تھے :-

یہ خطِ سبز تیرے منھ پہ آیا　　کہ جس سے حسن دونا لہلہایا　　معاصر جولائی ۶۴۲ء

دین و دنیا کی طلب تج، تجھے مطلوب کیا بلکہ عیار تمام آفت و آشوب کیا
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
جب ترے نقش کو میں دل میں خوش اسلوب کیا منھ ادھر پھیر کے تم ٹھاٹھ بہت خوب کیا

یاد آں شب کہ مرا نیز بہ بزمت رہ بود
چشم محبوب تو از راز دلم آگہ بود

تماشا یہ ہے کہ جس واسوخت کو عبدالباری آسی نایاب سمجھے ہوئے ہیں اور جس کے ۳۵ بند انھوں نے بیاض سے نقل کئے ہیں اور حشمت سے منسوب کرتے ہیں اس کے ۱۹ بند بجنسہٖ سودا کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں، اس واسوخت کو آسی مخمس سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترجیع بند یا ترکیب بند ہے۔

یا الٰہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال زلف خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے ایک مضمون "اُردو کا پہلا واسوخت، مطبوعہ معاصر اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ بتایا ہے کہ سودا کے مطبوعہ دیوان میں جو واسوخت ہے اس کے پہلے بند کا یہ پہلا شعر ہے۔ مگر آسی کی بیاض کے مطابق یہ واسوخت حشمت کے پہلے بند کا پہلا شعر ہے۔

کیوں رے دل جا ہی پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا عشق ہے دام بلا میں نہ تجھے کہتا تھا

قاضی صاحب موصوف نے حکیم محمد صالح عظیم آبادی کی بیاض میں حشمت کا وہ واسوخت دیکھا ہے جس کا ذکر تذکرہ میر حسن میں ہے، اور جس کے پہلے بند کا پہلا شعر درج ہے۔ آسی کی بیاض میں حشمت کے واسوخت کا یہ دوسرا بند ہے۔ مگر تعجب ہے کہ قاضی صاحب کی توجہ اس طرف نہ گئی کہ سودا کے مطبوعہ دیوان میں جو واسوخت ہے اس کا بھی دوسرا بند یہی ہے۔ الفاظ میں کچھ اختلاف ہے۔

نکہتِ گل نے ستایا کسے زندان کے بیچ پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

یہ شعر بہ حوالہ نکات الشعراء میر محتشم علی خاں حشمت کا ہے جو مغل پورہ میں رہتے تھے اور نکات الشعراء کی تصنیف کے زمانہ میں فوت ہو چکے تھے۔ اس شعر کا دوسرا مصرعہ فغاں نے بھی تضمین کیا ہے۔ آسی نے نایاب بیاض کے انتخاب صفحہ ۵۲ میں یہ شعر بہ حوالہ تذکرہ قدرت اللہ قدرت، محمد علی حشمت کے نام سے منسوب کیا ہے۔ آسی نے دونوں حشمت کو ایک ہی سمجھ کر بہت غلط مبحث کر دیا ہے نکات الشعراء میں دونوں حشمت کا ذکر ہے ایک تو وہی مغلپورہ والے، دوسرے محمد علی حشمت استاد تاباں و شاگرد غنی بیگ قبول، اور جو بہ قول میر "پاجیانہ اشعار" کہتے تھے اور جنگ روہیلہ میں شہید ہوئے۔

شیشۂ دل کو مرے سنگِ ستم سے پھوڑا دل نے میرے بھی منھ اب تیری طرف سے موڑا

بحوالہ شعرالہند جلد دوم صفحہ ۸۶ متذکرہ بالا شعر سودا کے واسوخت کے دسویں بند کا پہلا شعر ہے جو سودا کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے مگر آسی کی بیاض میں حشمت کے واسوخت کے بیسویں بند کا پہلا شعر ہے۔ پورا بند دونوں کے یہاں یکساں ہے۔

حاسداں تم کو جدا بیٹھ کے بہکاتے ہیں ہم سے دل توڑ تمھارے کو وہ بہلاتے ہیں

بحوالہ شعرالہند جلد دوم صفحہ ۸۶، میر حسن نے جو محتشم علی خاں حشمت کے واسوخت کا بند نقل کیا ہے اس کا یہ پہلا شعر ہے۔ مگر آسی کے نزدیک یہ واسوخت محمد علی حشمت کا ہے اور ان کی بیاض میں جو واسوخت ہے اس کا یہ چوبیسواں بند ہے۔ غرض یہ فیصلہ ابھی باقی ہے کہ واسوخت کا اصل مصنف کون حشمت ہے۔ اور سودا کے دیوان میں جو مطبوعہ واسوخت ہے اس کا مصنف سودا ہے یا حشمت؟ یہ ایک مستقل مضمون چاہتا ہے جو انشاءاللہ کسی دوسرے موقعہ پر پیش کیا جائے گا۔

خدا سے ٹک تو ڈر شیریں خبر لے اس بچارے کی　　کیا فرہاد نے تیشے سے سر لوہو لہان اپنا

اس زمین میں مرزا مظہر جانِ جاں (جانِ جاناں نہیں) کی بہت مشہور اور پرکیف غزل ہے آبِ حیات میں وہ غزل موجود ہے۔ رسالہ اُردو بابت جنوری ۳۲ء میں عبدالحق صاحب نے بحوالہ تذکرہ تحفۃ الشعرا افضل بیگ خاں بادۂ کہن کے عنوان سے جو مظہر کی غزل شایع کی ہے اس میں اور آبحیات والی غزل میں الفاظ کے اختلاف بکثرت ہیں، دوسرے یہ کہ یہ شعر آبِ حیات والی غزل میں نہیں ہے:۔

اے شیریں خدا سے ڈر خبر لے عاشق اپنے کی　　کیا فرہاد نے تیشے سوں سر لوہو لہاں اپنا

جو شعر میں نے پہلے نقل کیا ہے اُس میں اور اس میں تھوڑا اختلاف ہے، اس کو مظہر کا شعر ماں لینے میں کوئی عذر نہ ہوتا مگر ابھی حال ہی میں معاصر کے دورِ جدید کے پہلے حصّہ میں عرشی صاحب کا ایک مفید مضمون انند رام مخلص کے اُردو اشعار کے عنوان سے طبع ہوا ہے اس میں انھوں نے مخلص کے ۳۲ اشعار بزبان ریختہ خود مخلص کے مملوکہ دیوان سے نقل کئے ہیں جو اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ـــــــــــــــــــــــ اب تک مخلص کا صرف ایک شعر نکات الشعرا کے ذریعہ دستیاب تھا۔ اُن اشعار میں مخلص کی ایک غزل بھی ہے جس کا دوسرا شعر وہی ہے جس کو میں نے پہلے نقل کیا ہے اور لوہو لہان کے لفظ کو خود مخلص نے اپنے قلم سے بفتح لام اول وضمہ لام ثانی لکھا ہے۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی کہ یہ شعر مخلص کا ہے، مظہر کا نہیں۔ مظہر کی غزل میں یہ شعر الحاقی ہے۔ مخلص کے کلیات کا یہ مخطوطہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ ہے۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنے مضمون اُردو زبان کی قومی شاعری، مطبوعہ جامعہ جولائی ۲۴ء میں اس شعر کو سراج الدین بہادر شاہ ظفر سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ بلا اختلاف یہ شعر سراج اورنگ آبادی کا ہے۔ غالباً سراج کے نام میں ان کو تشابہ ہوا ہو۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

فراق نے یہ شعر اُردو کی عشقیہ شاعری صفحہ ۹۴ میں وفا رام پوری کے ساتھ منسوب کیا ہے حالانکہ یہ شعر رامپور ہی کے ایک "معاملتی شاعر" نظام کا ہے۔ بہرحال وطن کا شعر وطن ہی میں رہا۔

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے　　لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

یہ شعر گلِ رعنا اور گلشنِ ہند میں حسرت استاد جرأت کے ساتھ منسوب ہے، گلشنِ ہند میں یہ نوٹ بھی ہے کہ دوسرا مصرعہ جرأت سے بھی منسوب ہے۔ خمخانۂ جاوید میں پورا شعر جرأت کے کلام میں بھی درج ہے اور حسرت کے بھی۔

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز　　تجھ کو آخر آشنائے ناز بیجا کر دیا

یہ حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے مگر الیاس احمد صاحب مصنف "بہار" نے صفحہ ۹۱ پر غالب سے منسوب کر دیا ہو۔ یاللعجب

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

یہ شعر اقبال کا ہے مگر مصنف "بہار" نے صفحہ ۱۰۸ پر یہ شعر عابد سے منسوب کر دیا ہے ــ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

یاد رکھئے کہ نگار کا چندہ اب معہ محصول آٹھ روپیہ چھ آنے ہوگیا ہو جس میں سالنامہ کی قیمت بھی شامل ہو۔

زبان اور مارکسی فلسفہ

میرے پاس چند کامریڈ آئے اور خواہش کی کہ فلسفہ اور لسانیات کے ذیل میں اپنے خیالات ایک مضمون کی صورت میں شایع کردوں۔ میں لسانیات کا ماہر نہیں اسلئے ان کامریڈوں کی تشفی تو نہ کرسکوں گا مگر چونکہ فلسفۂ مارکس سے مجھے خاص تعلق ہے اس لئے ان کامریڈوں کی خواہش پوری کرنے کا اقرار کرلیا۔ (اسٹالین)

سوال ۔ کیا یہ صحیح ہے کہ زبان بنیاد (FOUNDATION) کے اوپر ایک عمارت (SUPERSTRUCTURE) ہے؟

جواب ۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔

کسی سماج کی تدریجی ترقی کے ہر دور میں بنیادی چیز اس کا اقتصادی نظام ہے اور عمارت نام ہے سماج کے سیاسی، قانونی مذہبی، صناعتی، فلسفیانہ، نظریات و عقائد کا اور اسی نسبت سے سیاسی و دیگر اداروں کی بنیاد کی مناسبت سے اس کی ایک جدا عمارت ہوتی ہے۔ جاگیرداری نظام کی بنیاد ایک خاص عمارت رکھتی تھی، اور اس کے سیاسی، قانونی نظریات کی مناسبت سے مخصوص ادارے بھی تھے۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام اور سوشلسٹ نظام کی بنیادوں کی بھی اپنی اپنی عمارتیں اور ادارے علحدہ ہیں۔ اب اگر یہ بنیادیں بدلتی ہیں تو عمارتیں بھی بدل جائیں گی۔

اس لحاظ سے زبان درحقیقت عمارت سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً روسی زبان کو لیجئے کہ جب پچھلے تیس برس میں پرانی سرمایہ دارانہ بنیاد اکھاڑ پھینکی گئی اور سوشلزم کی بنیاد پر ایک نئی بنیاد وجود میں آگئی تو سرمایہ داری کے اصول پر جو پرانی عمارت کھڑی تھی وہ بھی گرگئی اور اس کی جگہ، سوشلسٹ بنیاد کی مناسبت سے، ایک نئی عمارت بن گئی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر پرانے سیاسی، قانونی اور دیگر ادارے ختم ہوکر ان کی جگہ نئے سوشلسٹ ادارے قایم ہوگئے۔ بایں ہمہ روسی زبان بنیادی طور پر وہی رہی جو انقلاب اکتوبر کے وقت تھی۔ انقلاب کے بعد سے آج تک روسی زبان میں یہ فرق ہوگیا ہے کہ بہت سے نئے لفظ وضع ہوئے اور بہت سے پرانے لفظوں کے مفہوم میں تبدیلی پیدا ہوگئی، کیونکہ نئی ریاست وجود میں آنے، سوشلسٹ کلچر کی ترقی اور نئے سائنس اور تکنیک کے ردعمل سے ایسا ہونا ناگزیر تھا، بعض بعض لفظ متروک بھی ہوگئے۔ لیکن بنیادی ذخیرۂ الفاظ اور صرف و نحو کے قواعد بدستور وہی ہیں۔ چونکہ عمارت، بنیاد ہی پر قایم ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عمارت بنیاد سے علحدہ کوئی چیز ہے اور وہ سماج کے طبقوں سے واسطہ نہیں رکھتی بلکہ اسکے برخلاف وہ زبردست عملی قوت بن جاتی اور اپنی بنیاد کو تقویت دیتی ہے اور جب وہ اپنا یہ منصب ترک کردیتی ہے اور بنیاد کے تحفظ میں عملی مدد نہیں دیتی یا سماج کے طبقات کا لحاظ رکھنا چھوڑ دیتی ہے تو وہ اپنی خصوصیت کھو بیٹھتی ہے۔

زبان کسی سماج کی پرانی یا نئی بنیاد سے نہیں بنتی ہے بلکہ وہ اس سماج کی پوری تاریخ سے بنتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُسے کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج اس کے سارے طبقے اور اس سماج کی سیکڑوں نسلیں مل کر بناتی ہیں ۔۔۔۔۔ اس لئے کہ زبان کسی ایک دور، کسی ایک نسل یا کسی ایک طبقے کی ضرورت پورا کرنے کو نہیں بلکہ ساری نسلوں اور

اور سارے طبقوں کی ضرورت پورا کرنے کو وجود میں آتی ہے۔ اس لئے زبان اگر کسی طبقے میں محدود ہوکر رہ جائے اور باقی طبقوں کی مساوی خدمت کرنا چھوڑ دے تو وہ اپنا منصب ترک کردیتی ہے، پورے سماج اور اس کے تمام افراد کے درمیان اظہار خیال کا ذریعہ بننے کے قابل نہیں رہتی بلکہ ایک محدود جماعت کی بولی بنکر رہ جاتی اور اس طرح تنزل پذیر ہوکر رفتہ رفتہ فنا ہوجاتی ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ زبان پرانے اور نئے نظام کی یکساں طور پر خدمت انجام دیتی ہے۔ روسی زبان نے قبل انقلاب روسی سرمایہ داری اور بورژوا کلچر کی خدمت اسی طرح کی جس طرح آج وہ سوشلسٹ سماج اور کلچر کی کررہی ہے؟ بالکل یہی صورت یوکرینی، بیلو روسی، ازبک، کازاک اور بہت سی زبانوں کی ہے۔ جیسے مشین بے نیاز ہے کہ اسے کون چلا رہا ہے اور اس کا بنایا ہوا سامان کون برت رہا ہے اسی طرح زبان بے نیاز ہے کہ وہ سرمایہ داری سماج کی خدمت کررہی ہے یا سوشلسٹ سماج کی۔

اس کے مقابلے میں عمارت ایک تنہا دور کی پیداوار ہوتی ہے جس میں ایک خاص اقتصادی بنیاد زندہ رہکر کام کرتی ہے اور اسی لئے دیرپا بھی نہیں ہوتی۔ بنیاد مٹے گی تو عمارت بھی ڈھے جائے گی۔ برخلاف اس کے زبان چونکہ ایک دور کی نہیں بلکہ مسلسل دوروں کی پیداوار ہوتی ہے اور برابر ترقی کرتی رہتی ہے، اس لئے پائدار چیز ہے۔

پشکن کو مرے سو سال کے قریب ہوگئے اور اس مدت میں روس کا سامنتی سماج فنا ہوا، پھر اس کا سرمایہ دار سماج ختم ہوا اور ایک تیسرا یعنے سوشلسٹ سماج قائم ہوگیا ہے۔ یعنی دو پرانی بنیادیں اپنی عمارتوں کے ساتھ فنا ہوگئی ہیں اور ایک نئی سوشلسٹ بنیاد پر ایک نئی عمارت کھڑی ہوگئی ہے، لیکن روسی زبان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ آج کی زبان اور پشکن کے عہد کی زبان میں برائے نام فرق ہے۔ اس مدت کے اندر روسی زبان میں جو فرق ہوا وہ یہی ہے کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ بڑھ گیا، کچھ لفظ ترک کردئے گئے، بعض لفظوں کے مفہوم میں فرق پیدا ہوگیا اور صرف و نحو کے قاعدوں میں ترقی ہوگئی۔

انقلابات ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبان کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ بھی کچھ کا کچھ ہوجائے اگر ایسا ہو تو پانی، زمین، پہاڑ، جنگل، آدمی، چوپایہ، بیوپار وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ کیوں بولے جاتے؟ وہی صرف و نحو کے قاعدے کیوں جاری رہتے؟ تاریخ حقیقتاً کوئی ایسا کام نہیں کرتی جس کی ضرورت نہ ہو!

پھر جب یہ ثابت ہے کہ موجودہ زبان نئے نظام کی ضرورت کے لئے کافی ہے تو اس کے بدلنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا! یہ تو ہوتا ہے کہ چند سال کے اندر پرانی عمارت کو ڈھاکر اس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کردیجائے، تاکہ سماج کی پیداواری صلاحیتیں جمود سے نکل کر ترقی کے میدان میں آسکیں، لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ موجودہ زبان کو مٹاکر اس کی جگہ نئی زبان جاری کردی جائے۔ نئی زبان جاری کرنیکا یقینی نتیجہ سماج میں اختلال پیدا کرنا ہے۔

زبان اور عمارت کے درمیان ایک اور فرق ہے۔ عمارت بلا واسطہ انسان اور اس کی کارکردگی سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ بالواسطہ یعنی اقتصاد اور بنیاد کے ذریعہ سے رابطہ رکھتی ہے۔ اس لئے پیداواری قوتوں کی ترقی میں جو تغیر ہوتے ہیں وہ عمارت میں فوراً نمایاں نہیں ہوجاتے بلکہ بنیاد میں تغیر آجاتا ہے، تب منعکس ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف زبان کا تعلق براہِ راست پیداواری عمل ہی سے نہیں بلکہ اس کی ہر قسم کی حرکت و عمل سے ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ زبان اور اس کی فرہنگ ہر وقت متغیر حالت میں رہتی ہے، صنعت و زراعت کی مسلسل ترقی، تجارت اور رسل و رسائل کا مسلسل پھیلاؤ، تکنیک اور سائنس کی ترقیاں، اس بات کی متقاضی ہیں کہ زبان کے اندر نئے نئے لفظ ان کی ضرورت پورا کرنے کو اضافہ ہوتے رہیں۔ اور زبان ایسے الفاظ و مفاہیم کا اضافہ کرکے ان تغیرات کو منعکس کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ فلسفۂ مارکس کے پیرو زبان کو بنیاد کے اوپر ایک عمارت نہیں مان سکتے، اور ان دونوں کو خلط ملط کردینا فاش غلطی ہوگی۔

ل۔ احمد اکبرآبادی

افادات حسرت موہانی

چندر بھان برہمن

دلبستگی عجب چیز ہے اور دلبستگی سخن عجیب بھی ہے اور لطیف بھی - اسی کی بنا پر چندر بھان برہمن اکبر آبادی کے نام سے مجھے محبت ہے اوروں سے بھی گرویدہ ہوں - لیکن اس کا دلدادہ ہوں - دیوانہ ہوں ؎

کفِ پائے برزمینے کہ رسد تو نازنیں را | بلبِ خیال بوسم ہمہ عمر آں زمیں را

ہائے وہ بھی کیا دن ہوں گے جبکہ گوربخش حضوری ملتانی و آنند رام مخلص لاہوری - بیدل و خان آرزو سے اس خلوص سے ملا کرتے تھے کہ آج مسلمان مسلمان سے نہیں ملتا - مرزا غالب و منشی ہرگوپال تفتہ کی خصوصیاتِ محبت نے تفتہ کو مرزا تفتہ بنا دیا تھا - مرزا جعفر علی حسرت کی سرپ سکھ دیوانہ کے ساتھ ایسی کچھ ارادتمندیاں تھیں کہ آج کسی ہندو کو ہندو سے بھی نہیں ہوتیں -

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں بے تعصبی و خلوص نیت نے تفرقۂ مذہب کے خیال کو درمیان سے قاطبتاً خارج کر دیا تھا چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ زبان میں، طرزِ معاشرت میں، طریقِ گفتگو میں غرض کہ ہر بات میں ان دونوں کی اس درجۂ کمال کو پہونچ گئی تھی کہ فرق امتیازی کی دریافت بھی مشکل ہوگئی تھی -

حضوری، مخلص، دیوانہ، تفتہ کے علاوہ بھوپت رائے بیغم بیراگی، شیو رام داس حیا اکبر آبادی، لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی و عوض رائے مسرت شاہجہاں پوری کا بھی فارسی کلام مشاہیر شعرائے ہند میں سے کسی کے کلام سے کم نہیں ہے اور بیغم و برہمن کے تو اکثر اشعار معز فطرت و کلیم کے اشعار کے ساتھ برابری کا دعوے کر سکتے ہیں -

خوبیِ انداز کو دیکھنا برہمن کہتا ہے ؎

صبح است ابرو گوشۂ باغے غنیمت است | بوئے زبرگ گل بدماغے غنیمت است
پروانہ دار در طلبِ آتشِ وصال | افتادگی بہ پائے چراغے غنیمت است
گو منزلِ مراد زما دور دست یاد | در راہِ انتظار سراغے غنیمت است
چوں روزگار در گروِ اختیار نیست | از فکر روزگار فراغے غنیمت است
با دردِ عشق ساز برہمن کہ چند گاہ | الفت میان پنبہ و داغے غنیمت است

برہمن تخلص - چندر بھان نام - اکبر آباد کے رہنے والے تھے - افضل خاں شیرازی وزیر شاہجہاں کے ملازم تھے اور انھیں کے ذریعہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوئے - کچھ دنوں کے بعد سرکار شہزادہ دارا شکوہ میں منشی گری کے عہدے پر مقرر ہوگئے اور بہت جلد اپنی چرب زبانی و طاقتِ لسانی کی بدولت رتبۂ مصاحبت تک پہونچ گئے - قدرت اللہ خاں قدرت گوپاموی اپنے تذکرۃ الشعرا موسوم بہ نتائج الافکار میں ان کے متعلق ایک لطیف حکایت لکھتے ہیں - ان کا بیان ہے کہ ایک روز شاہزادے نے

شاہجہاں کی خدمت میں عرض کیا کہ چندر بھان ایک شاعر خوشگو ہے۔ اگر حکم ہو تو حاضر خدمت ہوکر کچھ اشعار پیش کرے۔ بادشاہ نے برہمن کو حاضری کا حکم دیا۔ انھوں نے آتے ہی عرض کیا ؎

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار   بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

شاہ دین پناہ کا مزاج اس سے کسی قدر مکدر ہوا، لیکن افضل خاں شیرازی نے بات بنادی اور فوراً کہا ؎

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود،   چوں بیاید ہنوز خر باشد

اور اس طرح بادشاہ کا تنغص دور ہوگیا۔ آخرکار شاہزادہ دارا شکوہ کی کوشش سے سلطنت شاہجہاں کے انتیسویں سال سرکار شاہی میں نوکری مل گئی اور خطاب رائے و منصب مناسب سے سرفراز ہوئے۔ محی الدین اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے زمانہ میں بھی ان پر نوازشات شاہی مبذول ہوتی رہیں اور ان کا تقرر خدمات نمایاں پر ہوتا رہا۔ آخر عمر میں نوکری سے استعفا دیکر شہر بنارس میں سکونت اختیار کی اور موافق رسم و راہ اہلِ ہنود ریاضات و عبادات میں مصروف ہوگئے اور سنہ ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔

تصوف کا رنگ اس زمانہ میں تمام شعراء کے کلام میں موجود ہے۔ برہمن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس انداز میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں اور کسی مسلمان کے کلام میں مطلق تمیز نہیں ہوسکتی۔ یہ بات کچھ تو اس زمانہ کے رواج اتحاد کی بنا پر ہے اور کچھ اس وجہ سے ہے کہ مسایل تصوف قید مذہب سے بالکل آزاد ہیں۔ مثلاً دیوان برہمن کی پہلی غزل ہے ؎

اے برتر از تصور و وہم و گمان ما   اے در میان ما و بروں از میان ما
آئینہ گشتہ سینۂ ما از فروغِ عشق   شد جلوہ گاہ صورت معنی نہانِ ما
جا کرد در میان رگ و ریشہ مہر دوست   پروردہ شد بمغز وفا استخوانِ ما
افتاد عشق حوصلہ فرسائے عاشق است   صد جا شکست تا بلب آمد فغانِ ما
مانند غنچہ گرچہ خموشیم برہمن   لیکن پر از نوا است چو بلبل زبانِ ما

اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا ہے جو عقائد براہمہ و عقائد مسلماناں دونوں کے موافق ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

رباعی

مارا ز سبوئے شبانہ مستی دگر ست   وارستگیٔ ز قید ہستی دگر ست
ما برہمنیم لیک در مذہب ما   حق دیگر و شغل بت پرستی دگر ست

برہمن کے خصوصیات کلام میں سے ایک یہ ہے کہ دو چار غزلوں کو چھوڑ کر جو "و" کی ردیف میں شاہجہاں بادشاہ کی مدح میں ہیں اور کسی غزل میں پانچ سے زیادہ شعر نہیں پائے جاتے۔ معلوم نہیں کہ اتنے ہی شعر کہتے تھے یا بعد میں انتخاب کرلیتے تھے۔ غالباً انتخاب ہی کرلیتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کی غزلوں میں بھرتی کے بہت کم اشعار پائے جاتے ہیں زبان ان کی نہایت شستہ ہوتی ہے اور بندش صاف۔ مطلب بالکل عام فہم۔ ترکیب درست ہوتی ہے اور بعض بعض مقامات پر نہایت خوب۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

ہر کہ پیش از صبحدم با ساغر صہبا نشست   سرفراز روزگارِ خویش چوں مینا نشست
بیا کہ بیتو دلم رنج بے حساب کشید   بیا کہ کارِ دل از غم باضطراب کشید
گر از تو جفا رفت نیامد گلہ از من   آئینِ جفا از تو خوش و حوصلہ از من
مرا در بزم رنداں آبروی میتواں دادن   بیکتا جرعۂ می رنگ و بوی میتواں دادن
زہی لب تو نمک ریزہ در شکر باری   شکنجِ زلف تو اندازۂ گرفتاری
ہرگز کسی نکرد نگاہے بسوئے ما،   کس گرم تر ز اشک نماند بروئے ما

سوئے ما حاجتِ شمشیر ستمگاری نیست — بہ تغافل نگہ مصلحت آمیز بس است

دلم بہ سنبل زلف تو تا قرار گرفت — میانِ سلسلۂ عشق اعتبار گرفت

خوش آں کسی کہ بہ صحرائے ملک ناکامی — ز سیل حادثۂ آرزو کنار گرفت

سر از دریچۂ صبح امید کرد بروں — کسے کہ دامن شبہائے انتظار گرفت

ترکیب کی خوبی کو دیکھا۔ اب الفاظ کی لطافت اور بیان کی روانی ملاحظہ ہو، کہتے ہیں ؎

ہوائے فصل و موسم بہاران ست — گلِ نشاط بدامان میگساران ست

زنار زلف بآسودگان مدہ بوئے — کہ ایں وظیفۂ دلہائے بیقراران ست

جنونِ عشق برہمن کشد بمستی کار — کہ عشق آفت احوال ہوشیاران ست

دیگر:-

جوانی بود فصل عیش و عہد کامرانیہا — کجا آں فصل کو آں عیش کی لے شادمانیہا

حدیثِ عشق از گفتار و تکرارست مستغنی — برہمن در محبت کفر باشد قصہ خوانیہا

تا ز کویش صبا نمی آید — دلِ عاشق بجا نمی آید

ناشناسائی حال خود گشتم — کارِ دیگر ز ماں نمی آید

آمد از خاک کوئے دوست بچشم — آنچہ از توتیا نمی آید

ایں خطاپوش ما۔ ز ما بگذر — کہ ز ما جز خطا نمی آید

از برہمن مخواہ کار دگر

کہ ازو جز دُعا نمی آید

نئے انگریزی مذاق یا انھیں کے بقول شایستہ مذاق کے لوگ اس بیان عشق و محبت کو فضول خیال کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تو مفید شاعری کے دلدادہ ہیں۔ سو برہمن کے یہاں ایسے حضرات کی بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ رنگ محبت کے ساتھ فلسفۂ عمل کے امتزاج نے عجب کیفیت پیدا کردی ہے، کہتے ہیں ؎

کفر بے رشتۂ و زنار نمی آید راست — کارکن کار کہ گفتار نمی آید راست

منزلِ عشق درازست سر از خواب برار — کار بے دیدۂ بیدار نمی آید راست

برہمن شیشۂ دل سخت نزاکت دارد — چوں شکستند دگر بار نمی آید راست

اس ضمن میں جو رباعیاں ہیں، اُن میں عمر خیام کا رنگ ہے۔ مثلاً عشق کے متعلق لکھتے ہیں ؎

رُباعی

سرمایۂ عیش جاودانی عشق ست — سرچشمۂ آبِ زندگانی عشق ست

اسباب نشاط و کامرانی عشق ست — عنوان صحیفۂ معانی عشق ست

دیگر

تا چند ز جور فلک آزردہ شوی — وز گردشِ روزگار افسردہ شوی

چوں غنچہ بجمعیتِ خود راضی باش — زاں پیش کہ گل شوی و پژمردہ شوی

ان سب مثالوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ برہمن کا پایۂ شاعری معمول سے کہیں زیادہ بلند ہے اور انھیں اساتذہ زبان فارسی کے زمرے میں شامل ہونے کا بوجود احسن حق حاصل ہے۔ کہتے ہیں :-

ہر نفس بوئے محبت آید از گفتار ما — میتواں فہمید از گفتار ما مقدار ما

یہاں وہاں سے

قوتِ حافظہ کے معجزے

دو سو سال اُس طرف کی بات ہے کہ ایک برہمن گنگا میں نہا رہا تھا اور کنارے پر دو انگریز کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ یہ جھگڑا بعد کو ہاتا پائی میں تبدیل ہوگیا اور نوبت مقدمہ بازی تک پہونچی۔ مدعی نے اس برہمن کو بطور گواہ کے پیش کیا تاکہ وہ بیان کرسکے کہ لڑائی کی ابتدا کیونکر ہوئی اور زیادتی کس نے کی۔ اس برہمن نے عدالت گاہ میں نہ صرف یہ کیا کہ لڑائی کی پوری نوعیت بیان کردی بلکہ اسی کے ساتھ ان دونوں نے جو جو باتیں کی تھیں وہ بھی لفظ بہ لفظ دہرادیں حالانکہ وہ انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھا۔

تاریخ میں اس قسم کے حافظہ رکھنے والوں کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک شخص پنڈت بنیشور، ہربالنکر نامے نے سنسکرت کے ۱۰۸ مصرعے جن کو اس نے ۱۲ سال کی عمر میں سنا تھا ایک موقعہ پر سب کے سب دہرا دئے۔

بعض لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ نام یاد رکھنے کی قوتِ حافظہ بڑی تیز ہوتی ہے، چنانچہ جولیس سیزر کو اپنے ہزاروں سپاہیوں کے نام یاد تھے اور امریکہ کے ایک ماہر نباتات آسا گرے کو ۲۵ ہزار پودوں کے نام یاد تھے، لیکن یہ قوتِ حافظہ کبھی کبھی مصیبت بھی ہوجاتی ہے، چنانچہ لتھونیا کا ایک پادری اسی مصیبت میں مبتلا تھا، اس نے دو ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور ان کا ایک ایک لفظ ہروقت اس کے ذہن کے سامنے رہتا تھا، یہاں کہ وہ بہت سی ان باتوں کو بھی نہیں بھلا سکتا تھا جن کو وہ بھلا دینا چاہتا تھا اور سخت پریشان رہتا تھا۔

رچارڈ پورسن، لندن انسٹی ٹیوٹ کا لائبریرین، یونانی زبان کی تمام کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی سنا دیتا تھا۔ لیون گمبیٹا فرانسیسی سیاستداں کو وکٹر ہیوگو کی تمام تصانیف حفظ تھیں اور بیکن نے ایک کتاب صرف اپنے حافظہ کی مدد سے تصنیف کردی۔

لارڈ مکالے کی قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے بغیر کسی کتاب کی مدد کے متعدد تاریخی کتابیں لکھ ڈالیں۔ آسکر وائلڈ کی طرح پورا صفحہ کا صفحہ ایک نگاہ میں ذہن کے اندر منقوش ہوتا تھا اور صرف ایک بار پڑھکر وہ کتاب کا پورا باب یاد کرلیتا تھا، چنانچہ اسنے ملٹن کی پراڈائز لاسٹ صرف ایک رات میں حفظ کرلی تھی۔

شمالی بہار میں صرف متھلا ہی ایک ایسا مقام تھا جہاں فلسفہ نیائے کی تعلیم حاصل کرنے طلبہ آیا کرتے تھے، لیکن یہاں کا طریق تعلیم سب سے علٰحدہ تھا۔ یہاں طالب علم نہ کوئی کتاب لیکر آسکتا تھا نہ کوئی کاغذ جس پر وہ کچھ لکھ سکے۔ یہاں تعلیم صرف زبانی ہوتی تھی اور اس کو دماغ میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا ـــــ ساڑھے چار سو سال کا زمانہ گزرا یہاں ایک لڑکا ندویپ کا تعلیم کے لئے آیا اور جب وہ یہاں سے فارغ ہوکر نکلا تو اسے ایک ایک لفظ یاد تھا، چنانچہ وہ سب باتیں ضبط تحریر میں لے آیا اور اپنے وطن میں فلسفہ نیائے کی تعلیم کا مدرسہ جاری کردیا جو بعد کو بہت مشہور ہوگیا۔

نپولین بوناپارٹ ایک ہی وقت میں اپنے بارہ سکریٹریوں کو بارہ خطوط علٰحدہ علٰحدہ لکھوا سکتا تھا لیکن امریکہ کے ایک شطرنج باز ہیری نلسن پلیسبری کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں آنکھوں پر پٹی باندھکر بیس آدمیوں سے شطرنج کھیل سکتا تھا اور بیسوں بساط کا نقشہ اس کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا۔

بعض لوگوں میں اعداد و شمار اور حساب کی سوجھ بوجھ غیر معمولی ہوتی ہے۔ ٹام فولر ایک حبشی غلام تھا اور بالکل ان پڑھ لیکن حساب کے لئے اس کا دماغ اس قدر موزوں تھا کہ ایک بار اس سے پوچھا گیا کہ ۷۰ سال ، ۱۷ دن اور بارہ گھنٹوں میں کتنے سکنڈ ہوتے ہیں تو اس نے ڈیڑھ منٹ میں اس کا جواب دیدیا اسی طرح ایک جاہل امریکی زیرا کولبرن تھا جس نے اپنی عمر کے آٹھویں سال میں صرف ذہن سے کام لیکر فوراً بتادیا کہ ۸ کو اگر ۱۶ مرتبہ ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب یہ ہوگا۔ ایک انگریز جبریگڈ بکسٹن حساب سے بالکل ناواقف تھا لیکن حساب کے لئے اس کا دماغ اس قدر موزوں تھا کہ جب وہ کسی کھیت سے گزرتا تو اس کا رقبہ فوراً انچوں میں نکال لیتا تھا اور جب وہ کسی کی تقریر سنتا تھا تو اخیر میں بتا دیتا تھا کہ مقرر نے کتنے الفاظ استعمال کئے۔

اس کے ایک صدی بعد ہمبرگ میں ایک شخص جان مارٹن پیدا ہوا جس نے سو ہندسوں کے ایک عدد کا Square root محض دماغ سے کام لیکر ایک گھنٹہ کے اندر بنا دیا۔ وہ سو ہندسوں کے عدد کو اس عدد سے صرف نو گھنٹہ میں ضرب دیکر حاصل ضرب بتا دیتا تھا۔

ہندوستان کے سوبش چندر باسو جب ۲۲ء اور ۳۳ء میں امریکہ و یوروپ گئے تو انھوں نے ریاضی کی مہارت کا ثبوت مختلف طریقوں سے دیا، چنانچہ انھوں نے ۱۰۰ ہندسوں کے ایک عدد اسی سے ضرب دیکر صرف ۵۲ سکنڈ میں حاصل ضرب بتا دیا۔

قوتِ ذائقہ آپ کی زبان کی نوک بھی قوتِ تخلیق کا بڑا راز ہے جسے ابتک سائنس داں پوری طرح معلوم نہیں کرسکے۔ ماہرین نفسیات اب تک نہیں سمجھ سکے کہ چیزوں کے مختلف مزے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ شکر کیوں میٹھی معلوم ہوتی ہے اور ایلوا کیوں کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی نہیں لیکن جب قوتِ ذائقہ کی کمسٹری پوری طرح دریافت ہوجائے گی تو اس کی حقیقت کا پتہ چل سکے گا۔

زبان کی نوک جو ایک انچ کے تیسرے حصہ کے برابر ہے اپنے اندر ذائقہ کے دس ہزار بلب یا قمقمے پنہاں رکھتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر بلب ایک خاص احساس کو دماغ تک پہونچاتا ہے۔ اس سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شخص کی قوت ذائقہ ایک سی ہوتی ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کی قوتِ ذائقہ بھی بینائی کی طرح کم زیادہ ہوتی ہے۔ ایک نئی کیمیائی چیز جسے Thiourea کہتے ہیں دس آدمیوں میں سے صرف چھ کو تلخ معلوم ہوتی ہے اور باقی چار کو پھیکی۔ ڈاکٹر جان ہکسلے اور دوسرے ماہرین سائنس نے ۲۷ چمپنزی بندروں پر اس کا تجربہ کیا تو بھی نتیجہ یہی برآمد ہوا۔

بچے بجائے زبان کے اپنے گالوں سے مزہ محسوس کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذائقہ کے بلب گال میں پائے جاتے ہیں جو عمر کے ساتھ ساتھ فنا ہو جاتے ہیں یا زبان کی نوک میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

تاش کے پتوں سے خودکشی قید خانوں میں اس بات کی بڑی احتیاط کی جاتی ہے کہ قیدی خودکشی نہ کرسکیں اور ہر ایسی چیز ان کی دسترس سے باہر رکھی جاتی ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ہلاک کرسکیں، لیکن پھر بھی بعض قیدی اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص ولیم کوگٹ نے جو پولینڈ کا باشندہ تھا خودکشی کا ایک ایسا ذریعہ دریافت کرلیا جو کسی کے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا۔

اس نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا اور اس کے پاداش میں اس کو سزائے موت دی گئی تھی اور وہ جیل میں تاریخ قصاص کا انتظار کر رہا تھا، وہ ہر وقت سوچا کرتا تھا کہ بجلی کے ذریعہ سے ہلاکت بڑی تکلیف دہ چیز ہے اس لئے کیوں نہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے اپنے آپ کو ختم کردے، لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی، کیونکہ اس کے پاس تاش کے ایک پیکٹ کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔

اس نے کسی سے سن رکھا تھا کہ تاش کے پتے Celluloid سے طیار ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا آؤ یہی تجربہ کرکے

دیکھیں، چنانچہ اس نے تاش کے پتوں کو پھاڑکر ریزہ ریزہ کردیا اور انھیں اپنے کھانے کے آہنی برتن میں بھگو دیا، جب وہ خوب گل گئے اور اس قدر نرم ہوگئے کہ اس کی لگدی بن سکتی تو اس نے اپنے پلنگ کا ایک آہنی پایہ الگ کیا اور اس کے خول میں اس لگدی کو اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرنا شروع کیا جیسے گز سے بندوق بھری جاتی ہے اور پھر اس پایہ کا منھ جھاڑو کے دستہ سے نہایت مضبوطی کے ساتھ بند کردیا۔

اس تمام اہتمام میں کئی گھنٹے صرف ہوئے اور جب نصف شب کے قریب وہ اس سے فارغ ہوا تو اس نے لمپ جلاکر اس پر اس پایہ کو رکھدیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب پایہ خوب سرخ ہوجائے گا تو اس نے جو کچھ اندر بھرا ہے وہ ضرور پھٹے گا اور بندوق کی سی آواز ہوگی، لیکن وہ اس سے بالکل بےخبر تھا کہ اس نے ایک بڑا طاقتور بم طیار کرلیا تھا، آخرکار یہ بم پھٹا اور نہ صرف اسکی کوٹھری بلکہ آس پاس کی آٹھ کوٹھریں اور اس کے دھماکے سے مسمار ہوگئیں اور اس نے اپنے ساتھ دوسرے متعدد قیدیوں کی جان بھی لی۔

ایک ادبی لطیفہ

لارڈ جارج انگلستان کی ایک بڑی مشہور ہستی گزری ہے اور اس نے جس شان سے وہاں کی وزارتِ عظمیٰ کی خدمات انجام دیں، وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی۔ اس کی کامیابی کے متعدد اسباب تھے، لیکن سب سے بڑی صفت اس میں یہ تھی کہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی اس کا دماغی توازن خراب نہ ہوتا تھا۔

انتخاب کا زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، لاڈ جارج بھی مختلف جلسوں میں اپنے انتخاب کا پروپاگنڈا کر رہے تھے۔

ایک دن وہ کسی جلسہ میں لوگوں سے خطاب کر رہے تھے کہ دوران تقریر میں ایک عورت جو لاڈ جارج سے سخت متنفر تھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور لاڈ جارج کو مخاطب کرکے بولی کہ:- "اگر میں تمھاری بیوی ہوتی تمھیں زہر دیدیتی"۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشتعل کردینے والا فقرہ تھا اور لاڈ جارج کی جگہ اگر دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً برہم ہوجاتا اور خدا معلوم کیا جواب دیتا لیکن آپ کو معلوم ہے لاڈ جارج نے اس کا کیا جواب دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے عورت سے کہا کہ "اے محترم خاتون اگر میں تمھارا شوہر ہوتا تو اس زہر کو میں نہایت خوشی سے پی جاتا"

لاڈ جارج کے اس فقرہ نے سارے مجمع کو اس کا طرفدار بنا دیا اور آخرکار ووٹ اسی کو زیادہ ملے۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوتِ صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کرچکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اسقدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کرسکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں۔ اس کو مثل آبِ حیات کے تصور فرمایئے، اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کرلیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کردے گی اس کے استعمال سے ۱۰ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنادے گی یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بلکہ مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کرسکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۲ خوراک چار روپیہ (للعہ)

نوٹ:- فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگایئے میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہیے۔ میری ۳۲ سالہ شہرت پر غور فرمایئے

پتہ:- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو-پی

آہنگ

فضا ابن فیضی اعظمی :-

میں اپنے بتکدے میں خود ہوں اک صنم پارا
کہ دستِ فکر نے پیکر مرا تراشا ہے،
سرود و شعر کے سانچے میں مجھکو ڈھالا ہے
جمال و مستی و جذب و سرور بخشا ہے
میں اپنے چرخ کا ہوں ایک لالہ گوں تارا

مرا وطن ہے سرود و سحاب و سبزہ و گشت
مری نگاہ میں جنت کی صبح ہوتی ہے
مرے نفس میں ہوائے بہار سوتی ہے
شرابِ فکر نوی میرے منھ کو دھوتی ہے
مرا مقام نہ مسجد نہ بتکدہ نہ کنشت

مرے قلم کا ہے اک رشحہ "نہرِ رکنا باد"
مری فضا سے ٹپکتی ہے شبنمِ تخئیل
ہیں میرے شانوں پہ آوارہ گیسوئے جبریل
ہر ایک ذرہ مری خاک کا ہے عرشِ جلیل
میں اک وجودِ ثریا سواد و عرش نہاد

یہ رنگِ گل یہ شگوفہ یہ خوشۂ پرویں
چراغِ لنترن و یاسمن و سرو و گلاب
شفق یہ قوسِ قزح یہ سفینۂ زرناب
لگے ہیں اس میں بھلا کون سے پرِ سرخاب
ہے ان سے زیادہ کہیں میری فکر شوخ و حسیں

وہ قطرہ ہوں جو ہے در اصل میکدہ انجام
اک آفتاب ہوں میں پیرہن میں ذرے کے
لہو کی موج سبک ہوں جگر میں لالے کے
میں نکہتوں کا ہوں ارمان دل میں غنچے کے
مرے نفس سے ہے روشن سوادِ شیشہ و جام

نظامِ شوق کو محکم بنا دیا ہیں نے
قدم قدم پہ ہیں روشن جوانیوں کے کنول
نسیم و نکہت و نشہ کے صاف رنگ محل
صراحیٔ مئے و معشوق و ماہتاب و غزل
جہاں کو جنتِ آدم بنا دیا میں نے

حجابِ ساز میں "آہنگ" بن کے رہتا ہوں
ضمیرِ کوکب و مہتاب میں نہاں ہوں میں
شعورِ نقرہ و نیلم کا نوحہ خواں ہوں میں
ہوں اک شاعرِ مفلس مگر جواں ہوں میں
کلی کے چہرے پہ اک رنگ بن کے رہتا ہوں

نظر سیہوری :-

اُسے حق ہے کہ وہ سارے چمن کو آشیاں سمجھے
جو ذوقِ باغباں جانے مزاجِ گلستاں سمجھے

بس اتنی بات تھی میں اپنی دھن میں خود سے غافل تھا
سمجھنے والے مجھ کو بے نیازِ دو جہاں سمجھے

مری نظروں میں یہ توہین ہے جہدِ مسلسل کی
جو تھک کر بیٹھ جائے وہ قفس کو آشیاں سمجھے

نظر آیا نہ کچھ بھی ہر طرف جز خود فریبی کے
ہنسی آئی جو ہم رازِ حیاتِ دو جہاں سمجھے

اک ایسی بیکسی کے دور سے بھی زندگی گزری
نظر جو اُٹھ گئی ہم پر اُسی کو مہرباں سمجھے

ہزاروں آفتیں ٹوٹیں، ہزاروں بجلیاں برسیں
مگر ہم زندگی بھر آشیاں کو آشیاں سمجھے

خدا جانے کہاں بھٹکا دیا ذوقِ تجسس نے
کہ ہم منزل کو بھی گرد و غبارِ کارواں سمجھے

نظر پردے اٹھائے میں نے گو روئے حقیقت سے
مگر اہلِ جہاں اس کو مرا حسنِ بیاں سمجھے

نوائے جرس

(پروفیسر جمیل مظہری)

کاروانِ ارتقا کے لئے

نظامِ مہر و ماہ کے مزاج داں بڑھے چلو ہیں ابر و باد و برق تم سے سرگراں، بڑھے چلو
بدل رہا ہے کائنات تیوریاں بڑھے چلو

پکارتی ہیں منزلیں نہ وہم ہے نہ خواب ہے یہ دیکھو آفتاب ہے وہ دیکھو ماہتاب ہے
بلا رہی ہیں دور سے بلندیاں، بڑھے چلو

بڑھائے جاؤ زندگی کی وسعتیں، بڑھے چلو گرائے جاؤ ممکنات کی حدیں، بڑھے چلو
بنائے جاؤ آسماں پہ آسماں بڑھے چلو

جلاؤ چاند کا دیا عمل کی بارگاہ میں بچھاؤ بادلوں کا فرش زندگی کی راہ میں
اُڑاؤ دامنِ ہوا کی دھجیاں، بڑھے چلو

اُٹھان ہو دباؤ میں وقار ہو جھکاؤ میں گھماؤ میں چڑھاؤ میں ندی کے اس بہاؤ میں
اُٹھائے اپنی کشتیوں کا بادباں بڑھے چلو

حقیقتیں زمین کی ہیں گردِ آستین کی اُبھر رہی ہیں نقشِ پا سے منزلیں یقین کی
اُتر رہی ہیں طور سے تجلیاں، بڑھے چلو

بہاریں راستے کی دیکھتے چلو، چلے چلو حقیر سا تبسم اُن پہ پھینکتے ہوئے چلو
یہ فطرتِ شریر کی ہیں شوخیاں بڑھے چلو

ہو ناز اپنے رنگ میں نیاز اپنی وضع پر ملے چکور چاند سے گرے پتنگ شمع پر
تم ان لطیف مشغلوں میں نغمہ خواں بڑھے چلو

رواج اپنی قید میں دلوں کو گھیرتا رہے خرد سمیٹتی رہے جنوں بکھیرتا رہے
مگر تم اپنی دھن میں سب سے سرگراں بڑھے چلو

جلو میں عہدِ رفتہ کی جوانیاں لئے ہوئے عروج اور زوال کی کہانیاں لئے ہوئے
حکایتوں روایتوں کے درمیاں بڑھے چلو

جھکے نہ سر بڑھے چلو، رُکے نہ دل بڑھے چلو کہ منزلیں ہیں منزلوں سے متصل بڑھے چلو
قدم قدم پہ ہو رہا ہے امتحاں بڑھے چلو

نشیب کیا فراز کیا خلیج کیا جبال کیا اصولِ دین و دہر کیا قیودِ ماہ و سال کیا
یہ بیڑیاں ہیں بیڑیاں ہیں بیڑیاں بڑھے چلو

ممانعت کی قید کیا، مخالفت کا زور کیا یہ آندھیوں کی چیخ کیا یہ زلزلوں کا شور کیا
یہ دھمکیاں ہیں دھمکیاں ہیں دھمکیاں بڑھے چلو

یہ حکمتیں یہ قدرتیں نظر کی میہماں ہیں، تجلیاں فریب ہیں ترقیاں گماں ہیں
ابھی دیارِ وہم میں ہے کارواں بڑھے چلو

بھرا ہوا ہے آنکھ میں ابھی غبار راہ کا ابھی حدودِ رنگ میں ہے قافلہ نگاہ کا
ابھی حجاب حُسن کا ہے درمیاں بڑھے چلو

ابھی تو لذّتوں میں گم ہیں قوتیں شعور کی ابھی تو عقل ہے کنیز شوقِ ناصبور کی،
ابھی تو عشق ہے خودی پہ حکمراں بڑھے چلو

ابھی حیات مانگتی ہے بھیک آفتاب سے ابھی تو خاک لے رہی ہے زندگی سحاب سے
ابھی تو یہ زمیں ہے زیرِ آسماں بڑھے چلو

نہ اقتدار ابر پر نہ اختیار باد پر نہ رحم ہے نبات پر نہ لطف ہے جماد پر
ابھی الوہیت کی منزلیں کہاں بڑھے چلو

بلند تر ہو قدسیت کے پایۂ جلیل سے نگاہِ جبرئیل سے تصورِ جمیل سے
پرے ہے عرش سے تمہارا آشیاں بڑھے چلو

مطبوعات موصولہ

اُردو تنقید کا ارتقاء یہ ایک مقالہ ہے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا جو انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ۱۹۴۲ء میں پیش کیا تھا اور اب اسے انجمن ترقی اُردو پاکستان نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ مقالہ کیا ہے ایک مستقل تصنیف ہے، ساڑھے پانسو صفحات کی جس میں فنی و تاریخی دونوں حیثیتوں سے "اُردو تنقید" پر نظر ڈالی گئی ہے، گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ کتاب "تاریخ الانتقاد" بھی ہے اور "نقد الانتقاد" بھی۔

اُردو ادب کی عمر کافی طویل ہے، لیکن اُردو تنقید حال کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں ادبی تذکرے اور سوانح تو پہلے بھی پائے جاتے تھے، لیکن ان کا ذکر ہم تنقیدی لٹریچر کے سلسلہ میں اس لئے نہیں کرسکتے کہ وہ انتقادی مراتب و خصوصیات سے بالکل خالی تھے اور ان کی حیثیت سُنی سنائی باتوں سے زیادہ نہ تھی۔

اُردو کے موجودہ دورِ تنقید کی ابتدا دراصل حالیؔ اور آزادؔ سے ہوتی ہے جن کی سوانحی و انتقادی تصانیف نے اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کو کافی متاثر کیا اور اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہاں رفتہ رفتہ صحیح معنی میں ایک جماعت نقادوں کی پیدا ہوگئی اور اب وہ اس قدر خطرناک تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہے مبادا کسی وقت ہمارے یہاں صرف نقاد ہی نقاد رہ جائیں اور ادب و ادیب دونوں ختم۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی جدید دورِ تنقید کے نہ ابتدائی حصہ سے تعلق رکھتے ہیں نہ آخری حصہ سے بلکہ درمیانی حصہ سے اور اسی لئے ان کے یہاں ایک "حد اوسط" کا سا اعتدال پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے جو بجنسہ کے تدریجی ارتقاء کے لحاظ سے ضروری تھے۔ پہلے باب میں انھوں نے تنقید کی اہمیت اور اس کی علمی حیثیت پر گفتگو کی ہے، دوسرا باب تنقید قدیم سے متعلق ہے جس میں مشاعروں، تذکروں، اور اساتذہ کی اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں دورِ حاضر کی تنقید کا آغاز، اس کی تقسیمیں اور حالیؔ، آزادؔ و شبلیؔ کا ذکر کیا گیا ہے، چوتھے، پانچویں باب میں وحیدالدین تسلیم، امداد امام اثر، مہدی، ڈاکٹر عبدالحق، محمود شیرانی وغیرہ کے انتقادی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے، چھٹے ساتویں باب میں مغربی اثرات پر عہدِ حاضر کے تمام مشہور نقادوں کے کارناموں پر اظہار رائے کیا گیا ہے، آٹھویں باب میں جدید رجحانات پر بحث کی گئی ہے اور نویں باب میں ادبی تاریخوں اور رسایل و جراید کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان ابواب کی تشریح کے بعد غالباً ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے کس قدر جامع ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کی ترتیب میں کتنی مورخانہ کاوش سے کام لیا ہے۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی۔

تنقیدی زاویے مجموعہ ہے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے دس انتقادی مقالات کا جو مختلف رسایل و جراید میں شایع ہوچکے ہیں، اس کا ایک مقالہ جو تنقید نگار ہی پر ہے، نظریاتی (Prolegomena) کی حیثیت رکھتا ہے اور باقی تمام مقالات گویا اس کے برقیاسے (Elucidations) ہیں جو اسی کے گرد گردش کررہے ہیں، ان مقالات میں کہانی کا ارتقاء۔ تغزل کی اہمیت، اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، اُردو شاعری کے جدید رجحانات اور اُردو افسانہ نگاری کی خصوصیت

کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں جن میں فاضل مصنف نے نہایت جامعیت کے ساتھ بہت سلجھے ہوئے انداز میں موضوع کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس طرح اسکی افادیت بہت زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ اُردو لاہور سے چار روپیہ میں مل سکتی ہے۔

حیات اکبر

بزم اکبر کراچی کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ تیسری کتاب ہے جس کو اصولاً سب سے پہلے شایع ہونا چاہئے تھا، ہمارے یہاں اکابر و اعاظم کے حالات میں تاریخی استقصار سے بہت کم کام لیا جاتا ہے جس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے سامنے پورے حالات نہیں ہوتے، لیکن یہ کتاب کلیتہً خود حضرت اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین کی مرتب کی ہوئی ہے، اس لئے اس کو یقیناً بہر نوع مکمل ہونا چاہئے۔

اس کتاب میں اکبر کے تمام حالات از "عہد تا بہ لحد" نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں بڑا شخص بننے کے لئے ایک انسان میں کیا خصوصیات ہونا چاہئے۔

ملا واحدی صاحب کی ترتیب، اکبر کی متعدد تصاویر اور طباعت و کتابت وغیرہ کی پاکیزگی نے اس میں اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ :- بزم اکبر کراچی۔

ترجمان اسرار

منظوم ترجمہ ہے علامہ اقبال مرحوم کے اسرار خودی کا جسے مکتبۂ کارواں ایبٹ روڈ لاہور نے شایع کیا ہے اسوقت تک میری نگاہ سے کم ایسی کتابیں گزری ہیں جو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے مغربی کتابوں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکیں۔

اسرار خودی علامۂ اقبال کا وہ کارنامہ ہے جس نے سب سے پہلے انھیں ایک فیلسوف شاعر کی حیثیت سے پیش کیا اور جو درصل پیشین گوئی تھی اس امر کی کہ اقبال شاعر کی حدود سے باہر نکل کر ایک مبلغ و حکیم بننے والا ہے۔ اس کی مخالفت بھی ہوئی، معاندانہ رائیں بھی ظاہر کی گئیں، لیکن کہنے والا جو کچھ کہہ گیا تھا وہ پتھر کی لکیر تھی اور اسی خط پر بعد کو پاکستان وجود میں آیا ظاہر ہے کہ ایسی اہم و دقیق کتاب کا ترجمہ اور وہ بھی نظم میں کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن جب میں نے اس کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور یہ ماننا پڑا کہ اگر اسرار خودی، اقبال ہی لکھ سکتا تھا تو اس کا ترجمہ بھی آنریبل شیخ عبدالرحمان ہی کر سکتے تھے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اقبال کے فلسفۂ اسرار خودی پر اتنی قابلیت و جامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے کہ اگر اسے خود ایک مستقل تصنیف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

یہ کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ میں مجلد شایع کی گئی ہو اور تین روپیہ میں مکتبۂ کارواں لاہور سے مل سکتی ہے۔

قاید اعظم

مولانا چراغ حسن حسرت نے اس کتاب میں قاید اعظم مرحوم کے تمام حالات عہدِ طفلی سے لیکر وفات تک کے یکجا کر دئے ہیں۔ گو کتاب مختصر ہے لیکن فاضل مولف نے مرحوم کے زندگی کا پہلو ترک نہیں کیا اور اس کو پوری مورخانہ سادگی کے ساتھ نہایت سلیس و سادہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔

یہ کتاب بھی مکتبۂ کارواں لاہور نے نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی ہے۔ قیمت ۱۲ر

نوائے سینہ تاب

مجموعہ ہے جناب جلیل قدوائی کی غزلوں اور نظموں کا۔ جناب جلیل نئے شاعر و ادیب نہیں ہیں بلکہ ۳۰ء میں آپ کے کلام کا ایک مجموعہ رنگ و نور کے نام سے اور چند کتابیں اور شایع ہو چکی ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب آپ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر کی خدمت پر مامور تھے، جناب جلیل، شاعری میں حسرت موہانی کے مقلد و متبع ہیں اور اتباع و تقلید میں وہ اس حد تک کامیاب ہیں کہ اگر زمانۂ مستقبل میں کسی نے کلیات حسرت میں جلیل کے اشعار یا کلیات جلیل میں حسرت کے اشعار شامل کر دے تو مطلق تمیز نہ ہو سکے گی۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کیا اس سے بھی پر درد کوئی ہوگا فسانہ — ہم جان سے جاتے رہے اور اس نے نہ مانا
دلیلِ ربطِ باطن ہے محبت آشنا دل کو — وہ طبع بے نیاز ان کی وہ طرزِ اجتناب ان کا
اس تمکنت پسند سے کس کو تھی یہ امید — دل ہی تو ہے تو نوازشِ پیہم سے رُک گیا

حسرت کا ایک مخصوص اسلوب بیان ہے، جس میں سادگی و حلاوت کے ساتھ کہیں کہیں دلنشین فارسی تراکیب کا امتزاج بڑی دلکشی پیدا کر دیتا ہے اور جلیل کے یہاں بھی بالکل یہی خصوصیت آپ کو نظر آئے گی ـــــ وہ متغزلانہ رنگ میں اس درجہ ڈوبے ہوئے ہیں کہ اگر ان کی نظموں کا عنوان حذف کر دئے جائیں تو وہ بھی غزل ہی نظر آئیں گی۔

یہ مجموعہ دو روپیہ میں بیگم ہرمزی قدوائی سے ۱۴ - جیکب لائن کراچی کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

رنگ و آہنگ

جناب ادیب سہارنپوری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب ادیب کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں ہے اور وہ عہدِ حاضر ہی کے ایک نوجوان شاعر ہیں، لیکن فکر و احساس کی پختگی کے لحاظ سے وہ موجودہ عہد کے اکثر شعراء سے ممتاز ہیں۔ عہدِ حاضر کے دوسرے شعراء کی طرح موجودہ زمانہ کے حالات سے وہ بھی کافی متاثر ہیں، لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو اس میکانکی آہنگ سے کبھی متاثر ہونے نہیں دیا جو شعر کے جمالیاتی پہلو کو داغدار کر دیتی ہے اور یہ معمولی بات نہیں، ان کے یہاں اسلوب بیان اور اندازِ فکر دونوں میں ندرت پائی جاتی ہے، لیکن دل کی کسک اور احساس کی دردمندانہ کیفیت سے کبھی خالی نہیں ہوتی ان کے ہر شعر کو پڑھ کر دل پر اثر ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل میں پھانس سی چبھ کر رہ گئی ہے۔

یو۔پی کے قابلِ ذکر شہروں میں سہارنپور ہی ایک ایسا شہر ہے جس نے اس وقت تک کوئی نامور شاعر پیدا نہیں کیا تھا، لیکن اس کمی کو جناب ادیب نے پورا کیا اور اس طرح کہ شاید مزید تلافی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ذیل کے چند اشعار سے آپ کو ان کے رنگِ سخن اور ذوقِ شعری کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے — باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا
یہ جوشِ بہاراں، یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں — دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں
جتنی ہوس کی انجمن آرائیاں بڑھیں — اتنے ہی بال شیشۂ ہستی میں آ گئے
خرد کے شیوۂ کارِ آگہی کا حال نہ پوچھ — جس آئینہ پہ جلا کی وہی خراب ہوا
علاجِ درد سے کچھ درد اور بڑھ ہی گیا — انھیں کا ذکر کیا آنے جانے والوں نے

اس قسم کے بلند و پاکیزہ اشعار ان کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

یہ مجموعہ تین روپیہ میں تاج آفس - بندر روڈ کراچی سے مل سکتا ہے۔

موج سلسبیل

مجموعہ ہے جناب نظر سیہوری کے مناقب، سلام و قصاید اور رباعیات و قطعات کا جسے ہند پبلی کیشنز (۲۰۱ شریف دیوجی اسٹریٹ بمبئی) نے خاص اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے، اس قسم کے غیر عشقیہ کلام میں، اکثر و بیشتر تصنع و آورد پایا جاتا ہے اور اسی لئے "نعت گو پوچ گو" بہت مشہور مقولہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر شاعر کے جذبات میں خلوص و صداقت ہو تو وہ ہر رنگ اور ہر صنف میں جان پیدا کر سکتا ہے۔

جناب نظر سیہوری کے اس مجموعہ میں آپ کو ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جو جذبۂ خلوص سے معرّا ہو اور ٹکنک کی معنویت کے لحاظ سے حدودِ تغزل کے اندر نہ آتا ہو۔ زبان کی سلاست و صفائی، تراکیب کی چستی و برجستگی، مفہوم کی بلندی و پاکیزگی، اور صالح غور و فکر ہر ہر شعر سے ظاہر ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

زاہد نہ چھیڑ رحمتِ یزداں کی گفتگو، ہم کر رہے ہیں تجزیۂ اہرمن ابھی
غمِ سرور ہیں دل کے داغ ہنگامی نہیں ہوتے کوئی موسم ہو یہ لالہ کے تختے لہلہاتے ہیں
ہوگئی ہیں نقش دل پر پنجتن کی صورتیں ایک ہی آئینہ میں تصویر پر تصویر ہے
زندگی پر ڈال لی جس نے حقیقت بیں نگاہ زندگی اس کی نظر میں بے حقیقت ہوگئی

رسول اللہ کی شان میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

وہ جس نے کائنات کا نظام ہی بدل دیا بہک چلے تھے جس سے سب وہ جام ہی بدلدیا
تکلفاتِ زیست کا طلسم بے اثر کیا مقاصدِ حیات سے بشر کو باخبر کیا
تمدنِ جدید کی بنا جہاں میں ڈال دی قدیم رسم کی بلا بشر کے سر سے ٹال دی

میں سمجھتا ہوں کہ مناقبی لٹریچر میں موجِ سلسبیل اپنے رنگ کی پہلی چیز ہے اور یقیناً بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔
قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

شہرِ خوباں جناب عدمؔ کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قومی کتب خانہ نیا بازار راولپنڈی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ عدم ایک خاص رنگ کے کہنے والے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ وہ طویل نظمیں یا غزلیں نہیں کہتے ہیں بلکہ زیادہ تر قطعات لکھتے ہیں اور وہ بھی دو بیت کے، لیکن ان میں وہ جذبات اور حسنِ تعبیر کے دریا بہا دیتے ہیں مثلاً :-

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے یہ مسکراتی ہوئی چیز مسکرا کے پلا،
سرورِ چیز کی مقدار پر نہیں موقوف شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

میں اگر جاسکا نہ منزل تک عجز سے لوٹ کر نہ آؤں گا
یا بگولوں کا روپ لیلوں گا، یا شعاعوں میں پھیل جاؤں گا

رونے والوں نے سلکِ ماتم میں، اپنے اپنے سروں کو جوڑا ہے
موت نے زندگی کی ٹہنی سے پھر کوئی تازہ پھول توڑا ہے

سارے مجموعہ ایسے ہی نوادر سے معمور ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے

فرزاں جناب جذبیؔ کے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جسے آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی نے بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے، جذبی کوئی غیر معروف شاعر نہیں ہیں، بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ مارکسی اسکول کی شاعری کے سختی سے پابند ہیں، آج کل کے نوجوان شعراء میں خاص امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ٹکنک بالکل کلاسکل قسم کی ہے اور یہ ایک نہایت موثر طنز ہے ان شعراء کے خلاف جنھوں نے آزادی و شاعرانہ آزادی کا مفہوم ہی بے راہ روی و بے اصولی قرار دے لیا ہے۔ جذبی ہنگامی ادب کے قایل نہیں ہیں، وہ شاعری کو برسات کا خود رو خس و خاشاک نہیں سمجھتے، بلکہ موسم سے فایدہ اُٹھاکر کوئی مستقل پایدار چیز پیدا کرنے کے قایل ہیں اور اس کے لئے کلاسکی، فن اور جمالیاتی نقطۂ نظر کی اہمیت کو وہ پوری طرح تسلیم کرتے ہیں، اسی لئے ان کے کلام میں وہ جان ہے جو عام طور پر دوسرے نوجوان شعراء میں کم پائی جاتی ہے۔

دار و رسن مجموعہ ہے باقیؔ صدیقی کی نظموں اور غزلوں کا جسے قومی کتب خانہ چوک نیا بازار راولپنڈی نے مجلد شایع کیا ہے، اس میں نظمیں کم ہیں اور غزلیں زیادہ، جس سے پتہ چلتا ہے کہ باقی کا زیادہ تر تغزل کی طرف مایل ہیں، غزلیں ردیف وار شایع نہیں کی گئیں بلکہ وقت کے لحاظ سے ان کو ترتیب دی گئی ہے۔ سب سے پہلی غزل انھوں نے ۱۹۳۶ء میں کہی اور آخری غزل ۱۹۵۱ء کی

ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہے اور ان دونوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶ سال کے زمانہ میں باقی نے تخییل وطرزِ بیان دونوں حیثیتوں سے کافی ترقی کی ہے۔

ان کی ابتدائی غزل کا رنگ یہ ہے:-

خونِ اخلاص کی بو آتی ہے پیمانے سے — رند گھبرا کے نکل آئے ہیں میخانے سے

لیکن آخری غزل کے بعض اشعار یہ ہیں:-

خورشید و قمر بھی دیکھ لیں گے — یہ راہگزر بھی دیکھ لیں گے
تاروں کا طلسم ٹوٹنے دو — انوارِ سحر بھی دیکھ لیں گے
جلتا ہوا آشیاں تو دیکھیں — ٹوٹے ہوئے پر بھی دیکھ لیں گے

باقی کی غزلوں اور نظموں میں ہمیں ہر جگہ وقت کی پکار کے علاوہ وہ اخلاقی بلندی بھی نظر آتی ہے جسے اس زمانہ میں عام طور پر غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ان کا کلام بہت سلجھا ہوا ہے اور فنی حیثیت سے بھی بڑی حد تک بے عیب ہے

فانوس چوتھا یا پانچواں دیوان ہے جناب شفیقی جونپوری کا جسے انھوں نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔ حضرت شفیق بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور شاعری کے اُس دور کی یادگار ہیں۔ جب شاعری ایک خاص کلچر سے تعلق رکھتی تھی اور زندگی کا مفہوم موجودہ اقدار و نظریات کے لحاظ سے بہت مختلف تھا۔ انھوں نے شاعری کو بربنائے ضرورت اختیار نہیں کیا بلکہ صرف اس لئے کہ وہ فطرتاً شاعر تھے اور شاعر بھی بلند اخلاق و خصایل کے، اسی لئے ان کے کلام میں ہم کو بہت سی ایسی چیزیں ملتی ہیں جو جدید شعراء کے یہاں ناپید ہیں۔

انھوں نے ابتدا میں ایک بسیط گفتگو شعر و ادب کے موضوع پر بھی کی ہے، جو اپنی جگہ بہت معقول اور قابلِ غور ہے اور جس سے خود ان کے نظریۂ شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

یہ دیوان دفتر بزم انیس جونپور سے مل سکتا ہے۔

ادب و نفسیات مجموعہ ہے جناب شکیل الرحمان کے انتقادی مقالات کا ــــــ شکیل صاحب صوبۂ بہار کے ایک نوجوان ادیب و نقاد ہیں، جنھوں نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا اور دو تین سال کے اندر ہی نقادوں کی صف میں اپنی جگہ پیدا کرلی۔

یہ مجموعہ ان کے گیارہ مقالات پر مشتمل ہے، جن میں سے بعض عمومی ہیں اور بعض خصوصی۔ قسم اول کے مقالات میں ادب و نفسیات ادب کی جدلیاتی ماہیت اور قسم دوم میں اکبر کا آرٹ اور ٹاگور کی شاعری، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ شکیل کے یہاں نری منطق ہی منطق نہیں، بلکہ عقل کی باتیں بھی ہیں (منطق اور عقل میں بڑا فرق ہے وہ مغالطہ پیدا کرتی ہے اور یہ مغالطہ دور کرتی ہے)۔ انداز بیان بھی بہت سلجھا ہوا ہے اور طریقِ استدلال بھی مستعار نہیں ہوتا۔ مارکسی اسکول کے نقادوں میں سب سے بڑا عیب ژولیدگی بیان ہوتی ہے اور وہ شکیل کے یہاں بالکل نہیں ہے۔

یہ مجموعہ تین روپیہ میں اشاعت گھر پٹنہ سے مل سکتا ہے، کاغذ، طباعت و کتابت وغیرہ سب میں نفاست و پاکیزگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

پرکھ مجموعہ ہے جناب غلام سرور کے چھ تنقیدی مقالات کا جسے اقبال بک ڈپو ہندرو پٹنہ نے شایع کیا ہے جناب غلام سرور صوبۂ بہار کے نہایت ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں اور دوران تعلیم ہی میں ادبی دنیا میں وہ متعارف ہوچکے تھے۔

اس مجموعہ میں تاریخ ادب اُردو- اور اُردو صحافت، تحقیقی مقالے ہیں اور ترقی پسند تحریک، مواد و ہیئت اور نظریاتی تنقید

انتقادی مضامین ہیں۔

غلام سرور کی یہ خصوصیت مجھے بہت پسند ہے کہ وہ فضول این و آں میں نہ اپنا وقت ضایع کرتے ہیں، نہ دوسروں کا، وہ صرف مطلب کی بات کہتے ہیں اور ایسے انداز میں گویا انھیں بہت کچھ کہنا ہے اور ادھر اُدھر دیکھنے کی فرصت ان کو کم ہے۔

وہ منطقی استدلات سے زیادہ کام نہیں لیتے، بلکہ صرف حقایق کو سامنے رکھتے ہیں، اس لئے ان میں نقاد کے ساتھ ایک مورخ ہونے کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے بیان میں نہ اُلجھن ہوتی ہے نہ خشونت، بلکہ واقعاتی سادگی ہے اور تاریخی تسلسل، اسی لئے ان کا لب و لہجہ زیادہ دلنشین ہے۔

مضمون نگاری جناب اخلاق دہلوی کی تالیف ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مضمون نگاری کیا چیز ہے، طلبہ کو مضمون نگاری میں کن کن باتوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے بہت سی معلومات ایسی بھی شامل کردی ہیں جو مضمون لکھنے میں کافی مدد پہونچا سکتی ہیں۔

یہ کتاب طلبہ کے لئے بہت مفید ہے، قیمت مجلد کاپی ۳ روپے ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، اُردو بازار دہلی۔

سیدنا محمدؐ رسول اللہ کی سیرت ہے جسے جناب محمد اجمل خاں صاحب نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے۔ سیرت نبوی پر مختصر و بسیط متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں، لیکن یہ موضوع ایسا ہے جس پر ہمیشہ بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے جن جن پہلوؤں سے سیرت نبوی کو پیش کیا ہے ان میں سے بعض یقیناً بالکل نئے ہیں اور اسی کے ساتھ کارآمد و مفید بھی۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت کہ وہ سیرت نبوی کے سلسلہ میں ایک Reference Book کی سی حیثیت رکھتی ہے مجھے بہت پسند آئی۔

ہمیں یقین ہے کہ فاضل مولف کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ضخامت ۲۰۲ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سنگم کتاب گھر۔ اُردو بازار دہلی

مذہبی استفسارات وجوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفانِ نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ۔ یونس اور دہانِ ماہی ۔ حُسنِ یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعا و توبہ ۔ لقمان ۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت ماروت ۔ حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط ۔ آتشِ نمرود وغیرہ ۔ ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید و دبیز ۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنہ

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان تخیل، اسکی نزاکتِ بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادئین کا مذہب۔ نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و شوق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر۔ فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصولِ نقد فنونِ ادبیہ، حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام ماجدولین نمبر ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادبیاتِ جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدنِ اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زریں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات علمی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقد و ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت [illegible] کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری [illegible] علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۲۹ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی وہ [illegible] کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے